چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ ایک۔۔۔

عنایت حسین عیدن

چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ ایک۔۔۔

چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ ایک۔۔۔

عنایت حسین عیدن

سٹار پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ
نئی دہلی۔۲

ISBN : 978-81-7650-606-9

کتاب کا نام: چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ ایک۔۔۔

مصنفت: عنایت حسین عیدن

ناشر: اسٹار پبلیکیشنز، پرائیویٹ لمیٹڈ

4/5B، آصف علی روڈ، نئی دہلی۔110002

سال اشاعت: 2014

قیمت: -/200 روپے

پرنٹنگ: اسٹار پرنٹ۔او بائنڈ، نئی دہلی۔ 110020

کمپوزنگ: محمد اکبر

CHHOTA BANGLA NAHIN BALKE EK.....

Enayet Hossen Edun

1st Edition 2014

ISBN No. : 978-7650-606-9

'- (Rupees Two hundred only)

Published by

Star Publication (P) Ltd.

4/5 B Asaf Ali Road, New Delhi-110002

PH: +91-11-23274874, 23261696, Fax : 23273335

email: info@starpublic.com

website: www.starpublic.com

انتساب

نورجنہ ، نایاب اور نعیم

کے نام

جو ہماری پوتیاں اور پوتا ہیں

فہرست

❑❑❑

پیش لفظ

ماریشس میں بھی کہانیاں سننے اورسنانے کا رواج تھا۔اٹھارویں اورانیسویں صدی میں فرانس، افریقہ، ہندوستان اور چین کے تارکین وطن اپنے اپنے علاقوں کی کہانیاں اپنے بچوں کو ضرور سناتے ہوں گے۔میرے دادا محمد حسین عیدن کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا مگر ان کو ایسی کہانیاں یاد تھیں جو انہوں نے پڑھے لکھے لوگوں سے سنی تھیں۔اس زمانے میں ایسے لوگ کم تھے ۔ دادا مرحوم ہمیں یہ کہانیاں شام کے وقت سنایا کرتے تھے اورہم بہت دلچسپی سے سنتے تھے۔ بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ کہانیاں 'آرائش محفل'، 'الف لیلیٰ'، 'مثنوی مولانا روم' سے لی گئی تھیں۔بعض اوقات ہماری دکان کے برآمدے میں دادا کے کئی دوست آکر بیٹھ جاتے تھے اور وہ بھی کہانی سناتے تھے۔کبھی کبھی توں سیموں جوعیسائی تھے اور بلراج دادا بھی کہانیاں سناتے تھے۔ سایہ دار پیڑ کے نیچے دن بھر کام کرنے کے بعد ان کے دوست اکثر جمع ہوتے اور کہانی سناتے۔کبھی کبھار مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔

ریڈیو اور ٹیلی وژن کے آنے سے یہ رواج تقریباً ختم ہوگیا

۔سینما ہال میں فلم حاتم طائی دیکھتے وقت دادا کی سنائی ہوئی کہانی ذہن میں تھی مگر اس میں اور نئی باتیں شامل کر دی گئی تھیں۔
اب بھی گھروں میں بعض مائیں اخلاقی کہانیاں سنایا کرتی ہیں۔

اسکول میں چارلس لیمب کا 'ٹیلس فرام شیکسپیر' سے کہانی پڑھنے کا آغاز ہوا۔ایک بار 'مل اے ان نوئی' جو الف لیلیٰ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہے پڑھنے کو ملا۔کلاس میں موپاساں کا ایک ''کونت'' پڑھایا گیا۔اس کا نام ''لاپاغیوغ'' تھا۔یہ کہانی الف لیلیٰ یا شیکسپیئر کی کہانیوں سے بالکل مختلف تھی۔اس کا ہیرو ایک بادشاہ یا شہزادہ نہیں تھا بلکہ فرانس کا ایک معمولی کلرک تھا۔ہمارے استاد نے سمجھایا کہ یہ کلرک ماریشس کا بھی ایک کلرک ہو سکتا ہے اور کہانی بھی اسی کلرک کی ہو سکتی ہے۔اس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ فرانس کا ایک کلرک ماریشس کے کلرک جیسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ ایک سال بعد مجھے موپاساں کی پندرہ کہانیوں کا ایک مجموعہ خریدنے کا موقع ملا۔ تمام کہانیاں چند ہی دنوں میں پڑھ ڈالیں۔یہ کہانیاں ان کہانیوں سے مختلف تھیں جن کو فرنچ زبان میں 'کونت' ہی کہتے ہیں جو بچوں کے لئے ہوتی ہیں۔ان میں پریوں اور جانوروں سے متعلق کہانیاں ہوتی ہیں۔موپاساں کی کہانیاں ان سے الگ تھیں۔ان کو پڑھ کر فرانس کی اس زمانے کی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔انگریزی میں ''کونت'' کا ترجمہ ''شارٹ اسٹوری'' ہوتا ہے۔جس نے بھی اردو میں شارٹ اسٹوری کا ترجمہ ''افسانہ'' کیا ہے اس کی نظر میں شاید لفظ ''کونت'' ہی رہا ہوگا۔

افسانے کے بارے میں علیگڑھ جا کر تفصیل سے جاننے کا موقع ملا۔ میرے مرحوم استاد اطہر پرویز صاحب کے لکچر اور ان کی کتاب سے افسانے کی جزیات اور خصوصیات کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ میرے استاد پروفسر قاضی عبدالستار صاحب کی کلاس میں افسانے کی خوبیوں، خامیوں اور باریکیوں کا اندازہ ہوا۔ آپ اردو کے عظیم افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ آپ ہمیں افسانے لکھنے کو اکسایا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے بڑی ہمت کر کے ان کو اپنا ایک افسانہ دکھایا تھا جس کا عنوان تھا ''میراث''۔ انہوں نے افسانے کی خامیاں اور خوبیاں بتائیں جن سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ انہوں نے مجھے لکھتے رہنے کی تاکید کی اور ساتھ ہی ساتھ اس پر بھی زور دیا کہ زیادہ سے زیادہ افسانے پڑھتا رہوں۔ ان کی ہمت افزائی سے افسانے لکھنا جاری رکھا۔ ذی نیشنل اردو انسٹیوٹ کی انجمن ادب اردو کی نشستوں میں اکثر میں بھی ساتھیوں کو افسانے لکھنے پر ابھارتا تھا۔ اسی انجمن میں کئی افسانے لکھے گئے اور رسالہ ''جستجو'' میں شائع بھی ہوئے۔ انجمن کی نشستوں میں، میں نے بھی کئی افسانے پڑھے تھے۔

اس مجموعے میں ایک کے علاوہ سبھی افسانوں کا پسِ منظر ماریشس ہے۔ یہ افسانے ۱۹۷۰ء سے ۲۰۱۳ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ہر افسانے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس زمانے کا ذکر ہو رہا ہے۔ ''لاوارث قبر'' کا پسِ منظر فرانس کا ہے۔ گذشتہ برسوں میں کئی بار فرانس اور انگلینڈ جانے کا موقع ملا۔ کہانی لکھنے کا خیال وہیں پر آیا۔ یہ نا انصافی ہوتی اگر میں اس افسانے کا پسِ منظر

وہاں کے بجائے کہیں اور کا رکھتا۔

ان افسانوں میں زبان و بیان کی اور دیگر خامیاں ہوں گی۔اہل زبان سے گذارش ہے کہ انہیں برداشت کر لیں کیونکہ خاکسار کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ آپ میری خامیوں کی طرف اشارہ کریں تو مجھے فائدہ پہنچے گا۔

میں ڈاکٹر ریاض گوکھل صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے خوشی خوشی ان افسانوں کو پڑھا اور اپنے خیالات اور تاثرات سے مجھے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا۔ رشاد برکت اور ڈاکٹر صابر گوڈر کا بھی شکر گذار ہوں۔ میں وسیم عبدالقادر کو تکنیکی امداد کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اسٹار پبلی کیشنز کے ڈائیرکٹر کا بھی ممنون ہوں کہ اس مجموعے کی اشاعت کی ذمہ داری لی۔

میری شریک حیات اور میرے بیٹے ظہیر اور ندیم کے تعاون کے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہوتا۔

عنایت حسین عیدن

ماریشس

hedun@yahoo.com

نوٹ۔ افسانوں کے سارے کرداروں کے نام فرضی ہیں۔

چھوٹا بنگلہ نہیں بلکہ ایک۔۔۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہمارے ملک نے اتنے کم عرصے میں اتنی ترقی کر لی ہے۔ میں پچیس سال بعد آیا ہوں۔ ہمارے گاؤں کی پکی سڑک کے کنارے کتنے سایہ دار پیڑ تھے جن کے نیچے میرے دادا اور تمہارے دادا بیٹھے بات چیت کرتے تھے۔ کبھی تو ان دونوں کے چار پانچ دوست بھی آجاتے اور وہ سب اس وقت وہاں سے نہ اٹھتے جب تک کہ اندھیرا نہ ہو جاتا۔ اب دیکھو کوئی درخت نہیں۔ ان کی جگہ نئی دکانیں ہیں اور۔۔۔" دھرم کہتا جا رہا تھا کہ اس کے لنگوٹیا یار فرید نے کہا:
" تم کیا سوچتے ہو، ترقی صرف تمہارے فرانس ہی میں ہوتی ہے۔ اب ہم ساٹھ سال کی عمر والوں کو پنشن تو ملتی ہے ہی مگر اس کے علاوہ بس میں جب چاہیں اور جہاں چاہیں ہم مفت میں جا سکتے ہیں۔ ہمارا گاؤں اب وہ گاؤں نہیں رہا جسے تم چھوڑ کر گئے تھے۔ دیکھو! کتنی عالیشان عمارتیں ہیں اور پھر ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنٹ بھی ہیں۔ ہاں وہ درخت تو کاٹے گئے پر ایک بات بتاؤں۔ اب تو

کسی کو فرصت ہی نہیں ملتی کہ درختوں کے سائے میں آکر بیٹھے اور اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے کو سنائے۔"

دونوں دوست فرید کے آنگن میں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ دونوں کے بال سفید ہونے لگے تھے بلکہ دھرم کے کافی بال گر چکے تھے۔دھوپ تیز نہیں تھی پھر بھی گرمی تھی۔" تمہارے آم کے پیڑ کے سائے میں بیٹھنے میں مجھے بہت مزہ آرہا ہے۔ تمہیں یاد ہے ایسے ہی ایک آم کے پیڑ کے نیچے ہم ڈومینو کھیلا کرتے تھے۔کھیل تو ہم دونوں شروع کرتے تھے اور چند لمحوں کے بعد رمیش اور طالب بھی آجاتے پھر ہم دونوں ٹیموں کے درمیان میچ شروع ہو جاتا تھا۔دیکھتے دیکھتے کئی اور لوگ آ جاتے تھے۔" دھرم نے کہا اور ایک آہ بھری۔

"اب تو طالب نہیں رہا تمہیں معلوم ہے نا۔میں رمیش کو بلواتا ہوں اور ہم یہیں بیٹھے ڈومینو کھیل سکتے ہیں۔جب تک تم یہاں ہو روزانہ آیا کرو میں تمہارا انتظار کروں گا"۔فرید نے کہا اور اپنے پوتے کو آواز دی۔" بیٹا رمیش دادا کو بلا لاؤ۔"

" دادا میں ان کو فون کرتا ہوں آپ بات کر لیجئے۔اگر آپ چاہیں تو میں جاتا ہوں اور ان کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔" پوتے نے کہا۔

"اس سیل فون نے تو ہماری زندگی ہی بدل دی ہے۔مگر ہے بڑے کام کی چیز۔" فرید نے کہا۔

پوتے نے جیب سے موبائل نکالا۔نمبر ملایا اور فرید کو دے دیا۔رمیش نے جواب دیا کہ اس وقت وہ ہسپتال میں ہے۔آج اس

کا آپائنٹمنٹ ہے۔پھر فرید نے اسے بتایا کہ دھرم آیا ہوا ہے اور اس سے بات چیت کرنے کو کہا۔

دوپہر میں رمیش آیا۔تینوں دوست بہت خوشی بات چیت کرنے لگے اور ڈومینو کھیلنے کا پروگرام بنا۔ چوتھا پارٹنر تو تھا نہیں۔فرید نے پوتے کو بلایا اور کہا: ''بیٹا اگر تمہیں فرصت ہو تو ہمارے ساتھ کھیلو۔ دیکھو تمہارے دھرم دادا فرانس سے آئے ہوئے ہیں۔ بچپن میں ہم پیڑ کے نیچے ہی ڈومینو کھیلتے تھے۔''

فرید کا پوتا مان گیا اور اسے اپنے دادا کے دوستوں کے ساتھ ڈومینو کھیلنے میں مزہ آرہا تھا۔

ایک مہینے کے بعد دھرم فرانس واپس چلا گیا۔اسے اپنے دوستوں سے جدا ہوتے وقت بہت تکلیف ہوئی۔

فرید اور رمیش روزانہ ملتے تھے مگر گاؤں کے دیگر ہم عمر دوستوں سے ہر روزکم ہی ملاقات ہوتی تھی۔اگرکسی سے ملاقات ہو بھی جاتی تو اسے گھر لوٹنے کی جلدی ہوتی تھی۔لوگ یہی سوچتے ہیں کہ ساٹھ سال کے بعد ملازمت سے ریٹائرمنٹ ہو جاتا ہے تو فرصت ہی فرصت ہوتی ہے۔لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ہر کسی کی اپنی مصروفیت ہو جاتی ہے۔ کسی کو ہر ہفتہ ہسپتال جانا پڑتا ہے تو کسی کو ہر صبح اور دوپہر پوتے پوتیوں کو اسکول پہنچانا اور گھر واپس لانا ہوتا ہے۔کسی کی بیوی یا بہو ہر وقت بازار بھیجتی رہتی ہے کہ یہ خرید لاؤ یا وہ خرید لاؤ۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ کئی لوگ بیوی یا بہو کے کہنے پر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے بازار آتے جاتے رہتے ہیں کیونکہ وہاں ان کے کئی ایسے دوست ہوتے ہیں

جو شراب پینے اور گپ شپ میں مصروف رہتے ہیں اور انہیں بھی ان دوستوں کے ساتھ ایک دو پیگ پینے کا موقع مل جاتا ہے مگر بیوی اور بچوں کے ڈر سے جلدی واپس آجاتے ہیں۔

فرید بھی ریٹائر ہو گیا ہے۔وہ ایک چپراسی تھا۔ ملازمت کے دوران اسے کئی وزارتوں کے دفتروں میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اخبار آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔روزانہ دفتر کے لئے اخبار خرید کر لانا اس کی ذمہ داری تھی۔دفتر سویرے پہنچنا، سب سے پہلے دفتر کھولنا اور صاف کرنا اس کی عادت تھی۔پھر افسران کی آمد کے انتظار میں وہ اخبار پڑھتا تھا۔اسی لئے اسے مقامی اور دنیا بھر کی خبروں کا علم ہوتا تھا۔اخبار پڑھنے کی عادت اب بھی ہے۔اس کے پوتے نے اسے بتایا کہ اب اخبار خریدنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس نے اے۔ڈی۔ایس۔ایل لگوا لیا ہے جس کے ذریعہ وہ چوبیس گھنٹے انٹرنٹ سے جڑا رہتا ہے۔پوتے کا ایک لیپ ٹاپ ہے اور گھر پر ایک پرانا کمپیوٹر بھی۔سرکار نے کمپیوٹر کی تعلیم عام کرنے کی خاطر عوام کے لئے ایک بنیادی کورس کا انتظام کیا تھا۔فرید نے بھی اس کورس میں حصہ لیا تھا۔ اسی لئے وہ کمپیوٹر ، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ واقف رہتا تھا کہ وطن اور دوسرے ممالک میں کیا ہو رہا ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت ٹی وی یا کمپیوٹر کے سامنے ہی گزارتا تھا۔ اسے اپنے دوستوں سے ملنا اور ان کے ساتھ وقت گذارنا بہت پسند تھا۔بچپن کے دوستوں میں سے چند تو اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ دو گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جا بسے تھے پھر

بھی اس کے کئی اور دوست تھے جن سے وہ ملتا رہتا تھا۔ یہ بھی ہوا کہ کئی نئے دوست بن گئے جو اسی کی طرح ریٹائیر ہو گئے ہیں یا اب مزید کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ مسلمان دوستوں سے تو مسجد میں ملاقات ہو جاتی اور نماز کے بعد تھوڑا سا وقت وہ ان کے ساتھ گزار لیتا۔ اس کے دوستوں میں ہندو اور عیسائی بھی تھے۔

فرید چاہتا تھا کہ جو لوگ ریٹائیر ہو گئے ہیں وہ اپنی نئی زندگی میں تھوڑی بہت تفریح کریں۔ اس سے ان کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ساٹھ سال سے زیادہ عمر والے لوگ اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر مشغول رکھیں اور دوست و احباب سے ملتے رہیں۔

ہر ہفتہ وہ اپنے چھ سات دوستوں کے ساتھ سمندر کے کنارے پکنک کے لئے جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اور چند دوست بس میں بیٹھ جاتے اور پھر طے کرتے کہ کہاں جائیں گے۔چونکہ ان کو بس میں ٹکٹ کا پیسہ نہیں دینا پڑتا تھا اسی لئے کبھی دور دراز علاقے میں چلے جاتے تھے۔ہاں سب کے پاس موبائل فون ہوتا تھا۔وہ اپنے اپنے گھر فون کرکے بتا دیتے تھے کہ اس وقت وہ کہاں ہیں اور کس وقت تک واپس آجائیں گے۔شروع شروع میں فرید اور رمیش کے علاوہ کوئی دوست سیل فون نہیں استعمال کرتا تھا۔اس کی ایک ہی وجہ تھی۔ وہ یہ کہ انہیں سیل فون استعمال کرنا نہیں آتا تھا۔

''بھئی تمہارے پوتے اور پوتیوں کے پاس پرانے سیل فون ضرور پڑے ہوں گے۔وہ بڑی خوشی خوشی تمہیں دے دیں گے اور

سکھا بھی دیں گے کہ کس طرح استعمال کرنا چاہئے۔اگر فالتو فون نہ ہوں تو وہ فون خرید لینا جو سب سے سستا ہو۔چھ سات سو روپے میں ضرور مل جائے گا۔البتہ یہ پرانے موڈل کے ہوتے ہیں مگر ہم بوڑھوں کے لئے بہت فائدہ مند ہیں۔'' ایک بار فرید نے ان سے کہا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کے ہر دوست کے پاس سیل فون ہو گیا۔اب پروگرام بنانا اور آسان ہو گیا۔جب سمندر کے کنارے پکنک کا پروگرام بنتا تھا تو چھ سات کے بجائے پندرہ بیس دوست ایک ساتھ ہو جاتے۔

ایک روز وہ موں شوازی کے ساحل پر پکنک کے لئے گئے تھے۔بڑے مزے لے لے کر صاف شفاف پانی میں وہ سب تیر رہے تھے کہ اچانک گھنے بادل چھا گئے اور زوروں کی بارش ہونے لگی۔ان کے کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے بھیگ گئے۔ان کے لئے چھپنے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مایوس ہو کر وہ بس اسٹاپ پر آئے اور بس کا انتظار کرنے لگے۔

'' کتنا اچھا ہوتا کہ سمندر کے کنارے ہمارا ایک بنگلہ ہوتا''۔رمیش نے کہا۔

'' ہم خواب کیوں دیکھیں ۔چلیں سرکار سے مانگ کریں کہ ہم بڈھوں کے لئے موں شوازی میں ایک بنگلہ بنایا جائے جہاں ہم بارش اور تیز دھوپ سے بچ سکیں اور اس میں ایک دو روز گزار بھی سکیں۔'' فرید نے کہا۔

" واہ کیا بات ہے۔مگر سرکار ہماری بات کہاں سنے گی۔" رمیش نے کہا۔

" میں ایسا کرتا ہوں کہ وزیر اعظم کو ایک خط لکھوں جس میں ان سے یہ درخواست کروں ہم بڈھوں کے لئے تیز دھوپ اور زوروں کی بارش سے بچنے کے لئے موں شوازی میں ایک بنگلہ بنائے۔ آخر ہم بڈھوں اور غریب لوگوں کے لئے بھی کچھ کرنا چاہئے۔نوجوانوں کے لئے سرکار اتنا پیسہ خرچ کر رہی ہے۔بچوں کے لئے اتنے اسکول ہیں۔ عورتوں کے لئے اتنے مراکز کھولے جا رہے ہیں تو ہمارے لئے کیوں نہ ایک ایسا بنگلہ بنایا جائے جہاں ہم دو تین دنوں کے لئے آ کر رہ سکیں اور ساتھ ہی ساتھ دوستوں کے ساتھ کچھ اچھا وقت بھی گزار سکیں۔" فرید نے کہا۔

" وزیر اعظم کے پاس یہ خط پہنچے تب تو۔" رمیش نے کہا۔

"یہ تم لوگ مجھ پر چھوڑ دو۔میں جانتا ہوں کہ کس طرح یہ خط وہاں پہنچایا جائے۔سرکار کو اس پروجیکٹ کو عمل میں لانے کے لئے زیادہ خرچ کرنا نہیں ہے۔زمین تو اس کے پاس ہے ہی۔ویسے عمارت بنانے میں زیادہ خرچ کرنا نہیں ہو گا۔ہاں، اگر ضرورت پڑے تو ہم بھی اپنی طرف سے مدد کر سکتے ہیں۔" فرید نے کہا۔

" بھئی میں تو ایک میسن ہوں۔ میں مفت میں وہاں جا کر کام کر سکتا ہوں۔" ایک دوست نے کہا۔

سب نے ایک بس کو آتے دیکھا مگر وہ رکے بغیر چلی گئی۔

"ہو سکتا ہے کہ بارش سے ہمارے کپڑے تر تھے اسی

لئے کنڈکٹر کی سازش سے ڈرائیور نے بس نہیں روکی۔بس کا نمبر نوٹ کرو۔'' فرید نے کہا۔

مگر بس بڑی تیزی سے جا چکی تھی۔ اگر نمبر معلوم ہوتا تو ڈرائیور کی شکایت کی جا سکتی۔

گھر آ کر فرید نے اپنے پوتے سے کہا کہ وزیر اعظم کو ایک خط لکھنا ہے۔

''یہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کیا لکھنا چاہتے ہیں؟ آپ کا خط وزیر اعظم تک کیسے پہنچے گا؟'' پوتے نے دادا سے پوچھا۔

'' بیٹا۔ تم میرے لئے یہ خط لکھ دو۔ وزیر اعظم تک میں پہنچا دوں گا۔'' فرید نے کہا۔

''اچھا آپ بتائیے کیا لکھنا چاہتے ہیں؟'' پوتے نے پوچھا۔

فرید نے بتایا کہ وہ چاہتا ہے کہ بڈھوں کے لئے سمندر کے کنارے ایک ایسا بنگلہ ہو جہاں وہ بارش اور تیز دھوپ سے پناہ لے سکیں اور کچھ اچھا وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گزار سکیں۔سرکار کو زیادہ خرچ کرنا نہیں ہوگا۔زمین تو اس کے پاس ہے ہی۔ ہم سب رضاکارانہ طور پر اس عمارت کی تعمیر کرنے کو تیار ہیں۔ ہاں یہ بھی ضرور بتانا کہ سرکار بڈھوں کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے۔

''یعنی وزیر اعظم کی تعریف کرنا۔'' پوتے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'' نہیں بیٹا، یہ حقیقت ہے۔ ان کو بتانا چاہئے۔'' فرید نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد پوتے نے فرید کو خط دکھایا۔اسے خط پسند آیا مگر وہ رمیش کو دکھانا چاہتا تھا۔ سیل فون پر بات چیت کے دوران رمیش نے بتایا کہ وہ اس سے ملنے آ رہا ہے۔رمیش کا لڑکا ایک کلرک ہے۔رمیش انگریزی تو پڑھ لیتا ہے مگر فرید نے کہا ''پڑھنے کے بعد اپنے لڑکے کو بھی دکھا دو۔''اور یہی ہوا۔خط میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت نہ پڑی۔

اگلے روز سویرے ہی فرید گورنمنٹ سینٹر پہنچا۔اپنے دوستوں سے ملاقات کی اور پتہ لگایا کہ وزیر اعظم کے دفتر میں کون سینیر چپراسی ہے۔اس سے فون پر بات کی اور وہ خود فرید سے ملنے آ گیا۔ اسے خط کے بارے میں بتایا۔

'' اب تو رام دیال صاحب ہمارے آفس میں آ گئے ہیں۔ انہیں پروموشن مل گیا ہے۔چلو۔ان کے پاس ہی چلتے ہیں۔'' فرید کے دوست نے کہا۔

فرید اس کے ساتھ رام دیال صاحب سے ملنے گئے۔

''ارے فرید۔آؤ۔آؤ۔تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔سب کچھ ٹھیک ہے نا۔'' رام دیال نے کہا۔

''مبارک ہو! آپ کا پروموشن ہو گیا ہے۔ آپ اس کے مستحق ہیں۔جس لگن اور محنت سے آپ کام کرتے ہیں مجھے یقین تھا کہ جلد ہی آپ کو ترقی ملے گی۔ آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وزیراعظم کا یہ خط آپ کے ہاتھوں سے ہی گذر کر جائے گا۔مہربانی کر کے یہ خط آپ پڑھ لیجیے۔ کچھ ٹھیک نہ ہو یا کچھ اضافہ کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے۔''

یہ کہتے ہوئے فرید نے رام دیال صاحب کو وہ خط دے دیا۔

"خط ٹھیک ہے۔ سمندر کے کنارے سینیر سیٹیزن کے لئے ایک آرام گاہ یعنی ایک بنگلہ بنانے کا خیال بہت اچھا ہے۔میں خود یہ خط لے کر وزیر اعظم کے پاس جاؤں گا اور اس کی اہمیت کا چرچا کروں گا۔مگر کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم پہلے سینیر سیٹیزن کی ایک ایسوسی ایشن بناؤ۔ایک دوسرا خط اس کی طرف سے آ جائے تو اس فرمائش کو تقویت مل جائے گی۔" رام دیال نے کہا۔

فرید نے بتایا کہ وہ آسانی سے اپنے دوستوں سے مل کر ایک ایسوسی ایشن بنا سکتا ہے اور جلد از جلد رجسٹرڈ بھی کروا سکتا ہے۔

"صاحب۔آپ کو وقت پر چائے مل جاتی ہے نا؟" فرید نے پوچھا۔

"ہاں۔لیکن تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے کو ترستا ہوں۔" رام دیال نے کہا۔

"صاحب۔ آپ حکم دیں تو ابھی ہی آپ کے چپراسی کے سامنے آپ کے لئے چائے بنا دوں تاکہ وہ سیکھ جائے کہ آپ کی چائے کیسی ہوتی ہے۔" فرید نے کہا۔

"یہ تو مہربانی ہو گی۔آتے رہنا۔"رام دیال نے چپراسی کو بلایا۔فرید اس کا دوست تھا۔

گھر واپس آنے سے پہلے وہ رجسٹریشن کا فارم لینے گیا اور ضروری معلومات بھی حاصل کی۔شام کو فرید رمیش کے گھر گیا

اور بتایا کہ اسے مشورہ دیا گیا ہے کہ ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے۔اسی وقت دونوں نے فیصلہ کیا کہ اگلے روز سب ہی دوست فرید کے گھر پر ملیں گے اور ایسوسی ایشن کو قائم کرنے کے بارے میں بات چیت کریں گے۔

"رمیش۔جب بھی کوئی میٹنگ ہوتی ہے تو اس کی کارروائی لکھی جاتی ہے۔ مجھے تو یہ لکھنا نہیں آتا۔" فرید نے کہا۔

"ارے یار۔ مجھے بھی کہاں آتا ہے۔" رمیش نے جواب دیا اور کہا: "چلو ہم ایسا کرتے ہیں کہ کسی سے لکھوا لیتے ہیں یا تو میرے لڑکے سے یا تمہارے پوتے سے۔دونوں میں سے جو بھی آسکے گا اسی سے لکھوا لیں گے۔اور ہاں۔جو کاغذات تم لائے وہ انہیں دکھا دیں گے۔"

اگلے روز سویرے ہی سے فرید اور اس کی بیوی سموسے بنانے میں لگے ہوئے تھے۔پکوڑوں کے لئے بیسن میں پانی، پیاز اور ہری پتیاں وغیرہ ملا کر رکھ دیا تھا تاکہ وقت پر تلا جا سکے۔ فرید پیسٹری بھی لے آیا تھا۔

منٹس یعنی مختصر روداد لکھنے کے لئے اس کا پوتا اور رمیش کا لڑکا دونوں تیار ہو گئے۔ان دونوں کو یہ جاننے کی دلچسپی تھی کہ یہ بڈھے کیوں ایسوسی ایشن بنانے جا رہے ہیں اور ان کی میٹنگ کیسی ہو گی۔رجسٹریشن کروانے کے جو کاغذات ملے تھے دونوں کو دے دئے گئے۔ان کو پڑھ کر اندازہ ہو گیا کہ ایک ایسوسی ایشن کے مقاصد اور قائدے قانون کیا ہیں۔

میٹنگ فرید کے ڈرائنگ روم میں ہوئی۔آم کے پیڑ کے نیچے

اس لئے نہیں رکھی گئی کہ وہاں کوئی بھی آ سکتا تھا یا راستے پر آنے جانے والے لوگ یہ سوچنے لگتے کہ کسی کا انتقال تو نہیں ہو گیا کہ اتنے لوگ جمع ہیں۔

فرید نے لوگوں کا استقبال کیا اور یہ بتایا کہ وہ وزیر اعظم کے دفتر میں خود خط چھوڑنے گیا تھا۔اسی دفتر میں اس کا ایک سابق اعلیٰ افسر اب وہاں کام کر رہا ہے۔اسی نے فرید کو یہ مشورہ دیا کہ اچھا ہوتا اگر ایک ایسوسی ایشن بن جاتی اور اسی کی طرف سے ایک خط بھیجتے تو اور بہتر ہوتا۔

"دادا، آپ کی ایسوسی ایشن کے مقاصد کیا ہوں گے؟" پوتے نے پوچھا۔

"ایک ہو تو بتاؤں۔" فرید نے کہا۔

"اچھا۔ پوچھ ہی رہے ہو تو سن لو۔ویسے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہمارے مقاصد کیا ہیں۔(۱)۔ایک دوسرے کی مدد کرنا (۲)۔تفریح کے لئے پروگرام بنانا(۳)۔ایک دوسرے سے کچھ سیکھنا (۴)۔تعلیمی اور معلوماتی پروگرام منعقد کرنا (۵)۔دوسرے ملکوں میں ایک ساتھ جانا وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔

بحث و مباحثے کے بعد رمیش کے بیٹے اور فرید کے پوتے نے کئی اور تجویزیں پیش کیں۔کئی مزید مقاصد کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ایسوسی ایشن کے نام بارے میں پوچھا گیا۔

"اولڈ مین ایسوسی ایشن کیسا رہے گا؟" فرید نے پوچھا۔

"اگر کل ہماری دادی اور نانی ایسوسی ایشن کا ممبر بننا چاہیں گی تو پھر نام بدلنا پڑے گا۔اسی لئے بہتر ہے کہ اولڈ پیپل

ایسوسی ایشن رکھا جائے تو اچھا ہو گا مگر آج کل سرکار اولڈ کے بجائے آپ لوگوں کو سینیر سیٹزن کہنے پر زور دے رہی ہے۔ پتہ ہے کیوں؟'' رمیش کے بیٹے نے کہا۔

'' بھئی ہمیں تو اپنے آپ کو بڈھا نہیں سمجھنا چاہئے۔'' ایک نے کہا۔

'' تو کیا ابھی تک ہم نوجوان ہیں؟ ذرا تیزی سے دوڑ کر تو دیکھو۔ سانس پھولنے کی آواز کتنی دور تک جاتی ہے۔'' ایک دوسرے نے کہا اور سبھی ہنس پڑے۔

نام پر بحث ختم ہوئی۔ فرید کے پوتے نے کہا کہ فارم میں ایسوسی ایشن کے صدر، سکریٹری، خزانچی اور اس کے ممبران کے نام لکھنے پڑیں گے۔ اس کے علاوہ اوڈیٹر کے نام چاہئے۔ سب کی خواہش تھی کہ فرید صدر ہو مگر فرید نے یہ بہتر سمجھا کہ وہ سکریٹری بنے کیونکہ ایک سکریٹری کو دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ چونکہ کئی سرکاری دفتروں میں اس کے جاننے والے بہت ہیں اسی لئے جو کام ہوں گے وہ آسانی ہو سکتے ہیں۔ آخرکار یہ طے ہوا کہ رمیش صدر بنے فرید سکریٹری۔ خزانچی کے لئے فیلیپ اور باقی سب ممبران بنے۔ اوڈیٹر کے لئے رمیش کے بیٹے اور فرید کے پوتے کے نام تجویز کئے گئے۔ ماہانہ فیس پانچ روپے رکھی گئی۔

'' مگر ہمیں تم دونوں کی ضرورت پڑتی رہے گی۔'' فرید نے کہا۔

دونوں بچوں نے ان سب کو یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ ان کا ساتھ دیں گے۔ خط وکتابت میں بھی مدد کرتے رہیں گے۔ بہت جلد

ہی ایسوسی ایشن رجسٹرڈ ہوگئی۔ فرید نے اس ایسوسی ایشن کے نام ہی سے وہ خط لکھا جو پہلے جا چکا تھا۔ یہ خط لے کر وہ وزیر اعظم کے دفتر گیا اور رام دیال صاحب کو دے دیا۔

فرید اور اس کے دوست پکنک کے لئے برابر جاتے رہے۔ اب تو کبھی کبھی ان کی بیویاں بھی ساتھ جانے لگیں۔فرید نے سوشل ویلفیئر سنٹر کے ہال میں اسوسی ایشن کی طرف سے صحت پر بات کرنے کے لئے کئی بار ڈاکٹروں کو بلایا۔ ایسے موقعوں پر تمام ممبران سے کہا جاتا کہ وہ اپنی اپنی بیوی کے علاوہ اور تین چار لوگوں کو ساتھ لائیں۔ایک نوجوان ممبران کو انگریزی اور فرانسیسی سکھانے کے لئے تیار ہوگیا۔اس نوجوان نے اپنے ہی یہاں پڑھانا شروع کیا۔اس کے طالب علموں میں زیادہ تر بڈھی عورتیں تھیں۔

ایک دوسرے نوجوان نے سیل فون استعمال کا طریقہ سکھانے کے لئے پیشکش کی اور بہت سے لوگ سیکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔

"میں بینک میں جاتا ہوں تو کارڈ سے پیسہ نکالنا نہیں جانتا ہوں۔کوئی اس کے بارے میں بتاتا تو بہت اچھا ہوتا۔" ایک نے کہا۔

"وہ بھی میں آپ لوگوں کو سکھا دوں گا۔بہت آسان ہے۔" نوجوان نے کہا۔

اب اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ فرید اور اس کے ساتھیوں کی سرگرمیوں میں بہت سے لوگ حصہ لینے لگے تھے۔

ایک روز سمندر کے کنارے گاؤں کے اسکول کا استاد

فرید سے ملا۔وہ حال ہی میں ریٹائر ہوا تھا۔

’’ میں نے سنا ہے کہ آپ لوگوں کی ایک ایسوسی ایشن ہے۔میں بھی اس کا ایک ممبر بننا چاہتا ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’ جی ہاں، ضرور بن سکتے ہیں مگر اس میں تو ہم سب ان پڑھ اور معمولی لوگ ہیں۔آپ تو پڑھے لکھے اور استاد بھی ہیں۔‘‘ فرید نے کہا۔

’’چچا۔اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔میں آپ کی مدد کر سکوں گا۔‘‘ استاد نے کہا۔

اب ایک استاد اس ایسوسی ایشن کا ممبر بن گیا۔پھر دیکھتے دیکھتے کئی اور لوگ آنے لگے۔فرید نے ان کو بتایا کہ اس نے وزیر اعظم کو ایک خط لکھا ہے جس میں اس نے مانگ کی ہے کہ سینیر سیٹزن کے لئے سمندر کے کنارے ایک بنگلہ بنایا جائے۔ایک نئے ممبر نے کہا کہ خط لکھنے کے بجائے ذاتی طور وزیراعظم سے ملنا چاہئے اور ان سے نہ صرف بات چیت کی جائے بلکہ ایک طرح سے دھمکی بھی دی جائے تاکہ یہ بنگلہ جلد از جلد بن جائے۔

’’ میرے خیال سے خط لکھنا بہتر ہے۔ہم وزیراعظم کو خواہ مخواہ کیوں جاکر پریشان کریں۔ ویسے بھی ان کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے۔رہی دھمکی کی بات، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔‘‘ فرید نے کہا۔

’’تم کیا جانتے ہو؟ کام ایسے نہیں ہوتا۔‘‘اس آدمی نے کہا۔

نئے ممبر آتے گئے۔ان میں سے اکثر فرید اور اس کے

ساتھیوں سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے بعد انہیں لوگوں میں سے کوئی صدر بن گیا، کوئی سکریٹری اور کوئی خزانچی۔فرید رمیش اور ان کے ساتھیوں کو بہت برا لگا۔ مگر اب بھی وہ پہلے کی طرح اپنے دوستوں کے ساتھ پکنک پر یا سیر کرنے جاتے رہے۔ہاں۔ان کو دوسری سرگرمیوں کے لئے دقتیں پیش آنے لگیں۔ نئے صدر اور سکریٹری کو مروجہ سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

نئے ممبران نے وزیراعظم کو ایک استقبالیہ دینا چاہا۔ اسی موقع پر ایسوسی ایشن کا صدر بنگلے کے بارے میں وزیر اعظم سے درخواست کرتا مگر انہوں نے مصروفیت کی وجہ سے منظور نہیں کیا۔دراصل صدر اور سکریٹری کا خاص مقصد یہ تھا کہ وہ ٹی وی اور پریس والوں کے سامنے آئیں اور ہرحالت میں شہرت حاصل کریں۔ایک مقامی سیاسی ایجنٹ کی مدد سے اس علاقے کے ایم ایل اے اور ایک منسٹر کو استقبالیہ دینے کا پروگرام بنا۔اس میں فرید اور اس کے دوستوں کو شرکت کرنے کی دعوت نہیں تھی حالانکہ وہ ابھی تک اس ایسوسی ایشن کے ممبر تھے۔ان سب کو بہت برا لگا مگر فرید نے ان کو سمجھایا کہ انہیں کی غلطی تھی کہ اپنے سے اونچے درجے کے لوگوں کو اپنے ساتھ لیا۔

”ایک ایسوسی ایشن بنانا ہم جیسے معمولی اور ان پڑھ لوگوں کے لئے بہت آسان ہے۔شاید ان کے لئے مشکل تھا۔“ فرید نے کہا۔

”واہ اب دیکھو وہ دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ ان ہی کی

مانگ پر سرکار یہ بنگلہ بنائے گی۔'' رمیش نے کہا۔

اس استقبالیہ میں صدر اور سکریٹری نے ایم ایل اے اور منسٹر کی خوب تعریفیں کیں۔ لگے ہاتھ ان سے درخواست کی کہ سینیر سیٹزن لئے ایک بنگلہ بنوا دیا جائے جہاں وہ سمندر کے کنارے اسی طرح لطف اٹھا سکیں جس طرح امیر اپنے ساحلی بنگلوں میں رہ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مقامی ایم ایل اے اور منسٹر نے انہیں یقین دلایا کہ اس بنگلے کو بنانے کے لئے وہ زمین آسمان ایک کر دیں گے اور وزیر اعظم کو بھی مجبور کریں گے کہ اس ایسوسی ایشن کی مانگ ہر حالت میں پوری کریں۔ اس تقریب کے لئے منسٹر کے پریس اتاشی (press attaché) نے ٹی وی اور دوسرے اخبار والوں کے آنے کا بھی انتظام کر لیا تھا۔

فرید نے اپنے دوستوں کو بتا دیا تھا کہ ٹی وی پر ضرور خبریں دیکھیں اور اس نے ایک اخبار بھی خرید لیا تھا جس میں اس استقبالیہ پر ایک رپورٹ تھی۔ اخبار پڑھ کر فرید اتنے زور سے ہنسا کہ اس کی بیوی دوڑی آئی۔ صدر اور سکریٹری نے جو کچھ کہا تھا اس کا تو ذکر ہی اخبار میں نہیں تھا۔ صرف منسٹر کی تصویر اور اس کی تقریر کا ایک حصہ تھا۔ اسٹیج پر بیٹھے مہمانوں کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ ٹیلی وژن پر بھی صرف منسٹر کو بات کرتے ہوئے دکھایا گیا، وہ بھی صرف ایک لمحے کے لئے۔

ایسوسی ایشن کے صدر اور سکریٹری اس جلسے سے خوش نہیں تھے کیونکہ ان کا چرچا اخباروں میں نہیں ہوا۔ اب ان کی یہ خواہش تھی کہ اگلے پروگرام میں وزیر اعظم کا ہونا ضروری ہے۔ ایک

دوسرے پولیٹیکل ایجنٹ سے بات چیت ہوئی۔اس نے یہ مشورہ دیا کہ بڈھے لوگوں کو ایک لنچ دیا جائے۔ اس میں کافی بھیڑ ہو جائے گی اور وزیراعظم کو بتایا جا سکتا ہے کہ یہ ایسوسی ایشن بھیڑ جمع کر سکتی ہے۔ صدر ہچکچایا مگر ایجنٹ نے کہا ''کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو خرچ بھی کرنا چاہیئے۔ تمہیں یہ بتانے کا موقع مل رہا ہے کہ تم میں کتنا دم ہے۔''

اسی جمعے کو وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ سینیر سیٹزن کے لئے سمندر کے کنارے ایک بڑا سینٹر بنایا جائے گا جہاں ان کی تفریح کے لئے انتظامات ہوں گے اور جہاں وہ چند دن گزار بھی سکیں گے۔یہ اعلان سن کر فرید اور اس کے دوست بہت خوش ہوئے مگر ایسوسی ایشن کا صدر بالکل مایوس ہو گیا۔اس نے بڈھوں کے لنچ کا پروگرام رد کر دیا۔

سینٹر کی سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے ایک تقریب منعقد ہوئی جس کے خصوصی مہمان وزیراعظم تھے۔ انہیں کے ہاتھوں سنگِ بنیاد رکھی جانی تھی۔تقریب میں سب ہی منسٹر، ایم ایل اے اور سرکار کے اعلی عہدےدار بھی شریک تھے۔آس پاس کے ولیج کونسل (village council) کے ممبران بھی مدعو تھے۔یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پولیٹیکل ایجنٹ اپنا چہرہ دکھانے کے لئے حاضر تھے۔سینیر سیٹزن کے تمام ممبران کو دعوت تھی مگر صرف صدر اور سکریٹری سوٹ بوٹ میں اپنی اپنی گاڑی سے وہاں سب سے پہلے پہنچ چکے تھے۔رام دیال صاحب بھی اس روز وہاں اپنی ڈیوٹی پر تھے۔ اسے پورا یقین تھا کہ فرید وہاں ملے گا۔آخر وقت تک وہ اسے ڈھونڈتے

رہے مگر کسی سے نہ پوچھا۔ہاں ایسوسی ایشن کے صدر اور سکریٹری ان سے ملنے آئے اور اپنا اپنا تعارف بھی کیا۔رام دیال کو اب معلوم ہو گیا کہ معاملہ کیا ہے۔

ٹیلی وژن پر اس تقریب کی جھلکیاں دکھائی گئیں۔ اگلے روز فرید اور اس کے تمام ساتھی اس جگہ کی تلاش میں نکلے جہاں سنگِ بنیاد رکھی گئی تھی۔ جگہ موں شوازی میں نہیں بلکہ وہاں سے سات آٹھ کلومٹر دور تھی۔وہاں پہنچے ۔یہ جگہ موں شوازی کے ساحل کی طرح نہیں تھی۔ بڑے بڑے پتھروں کی وجہ سے وہاں سمندر میں تیرنا منع تھا،جس کی وجہ سے وہ سبھی مایوس ہو گئے۔ پھر بھی جگہ خوبصورت تھی اور آلودگی سے پاک۔تھوڑی دیر بعد دو تین گاڑیاں آ کر رکیں۔چھ سات لوگ گاڑیوں سے اترے۔ ایک کے ہاتھ میں بہت سے کاغذات تھے۔فرید نے اسے پہچان لیا۔ وہ انجینئر تھا جس کے ساتھ فرید کام کر چکا تھا۔اسے دیکھ کر انجینئر نے اسے بلایا اور پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے۔

"بس ہم یہ دیکھنے آئے ہیں کہ بڈھوں کے لئے ایک بنگلہ کہاں بنایا جائے گا۔" فرید نے کہا۔

"کس نے کہا ہے کہ یہاں بنگلہ بنے گا؟۔ ارے یہاں تو تین بڑی بڑی عمارتیں بنیں گی جن میں سو کمرے ہوں گے۔اب رہی بات تیرنے کی ۔یہاں ایک سویمنگ پول ہوگا جس میں سینیر سیٹزن بغیر خطرے کے تیر سکیں گے۔ اس کا ایک چھوٹا سا نقشہ دیکھو۔" انجینئر نے کہا اور اپنے بستے سے ایک کاغذ نکالا اور فرید کو دکھایا۔

"کیا میں اپنے دوستوں کو دکھا سکتا ہوں؟" فرید نے پوچھا۔

انجینئر خوش ہوا اور اجازت دے دی۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سرکار ایک چھوٹا سا بنگلہ نہیں بلکہ تین بڑی بڑی عمارتیں بنائے گی۔

''فرید آج کل تم کیا کر رہے ہو؟ کس منسٹری میں کام ہو رہا ہے؟'' انجینئر نے پوچھا۔

''کام کہاں۔ اب تو ریٹائر ہو گیا ہوں۔بس آرام ہی آرام ہے۔میرے یہ دوست بھی ریٹائر ہو گئے ہیں اور ہم ایک ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ صاحب یہ آپ لوگوں کی مہربانیاں ہیں۔'' فرید نے کہا۔

''تم تو ساٹھ سال کے نہیں لگتے۔ چلو ٹھیک ہے۔ریٹائرمنٹ بہت مبارک ہو۔ بس صحت کا خیال رکھنا۔مجھے تمہاری چائے ابھی تک یاد ہے۔واہ'' انجینئر نے کہا۔

ایک سال کےاندر اندر عمارتیں بن گئیں، سینٹر تیار ہو گیا۔ افتتاح کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔ وزیراعظم ہی افتتاح کرنے والے تھے۔ اس تقریب کے لئے کئی علاقوں کے سینیر سیٹزن کو دعوت دی گئی اور ان کے لیے خاص بسوں کا انتظام تھا۔ اس بار بھی ایسوسی ایشن کے صدر اور سیکریٹری اکیلے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے مگر سیاسی ایجنٹوں نے اپنے اپنے علاقوں کے بڈھے لوگوں کے لئے بسوں کا انتظام کر لیا تھا۔

افتتاح سے ایک دن پہلے ایک پولیس انسپکٹر فرید سے ملنے آیا۔ پولیس کی گاڑی دیکھ کر آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔رمیش بھاگا بھاگا فرید کے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ فرید نے

دروازہ کھولا اور اس کو اندر آنے کو کہا، پھر انسپکٹر سے ملایا۔

'' کیا آپ سب لوگوں کے لئے ساٹھ سیٹوں والی ایک بس کافی ہو گی؟۔آپ سب کو آنا ہو گا۔ میاں بیوی دونوں کو۔ کل تین بجے تقریب شروع ہو گی۔ آپ سب کو وہاں دو بجے پہنچ جانا چاہئے۔ ایک بجے بس یہاں آ جائے گی۔میں چلتا ہوں۔کل میں بھی وہاں ہوں گا اور آپ لوگوں سے ضرور ملوں گا۔'' پولیس انسپکٹر نے کہا۔

'' انسپکٹر صاحب میں آپ کا شکر گزار ہوں۔آپ تشریف رکھئے۔میری بیوی آپ کے لئے چائے لا رہی ہے۔''فرید نے کہا۔

فرید کی ڈیوٹی ایسی تقریبوں میں کئی بار لگی تھی اسی لئے وہ اس کا عادی تھا مگر اس کی بیوی اور اس کے دوستوں کے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔بس کے آنے سے پہلے ہی رمیش اور اس کے تمام ساتھی اپنی اپنی بیوی کے ساتھ فرید کے یہاں آ گئے تھے۔بس آئی اور دو بجے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔ایک بہت بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا۔بہت سے لوگ سوٹ بوٹ میں تھے مگر فرید اور اس کے دوست سوٹ نہیں بلکہ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

کئی منسٹروں نے تقریریں کیں۔ہر ایک نے وزیراعظم کی تعریف کی اور یہ کہا کہ یہ ایک ایسا منصوبہ ہے جس ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بزرگوں کا کتنا خیال کرتے ہیں۔پھر وزیراعظم نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ڈھائی سال پہلے انہیں ایک ریٹائیرڈ آدمی کا خط ملا تھا جس نے اتنا متاثر کیا تھا کہ اسی روز سے انہوں نے بزرگوں کے لئے ایک عالیشان ریکیری ایشن سینٹر(recreation centre)

بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔اس خط میں بزرگوں کے لئے سمندر کے کنارے ایک بنگلہ بنانے کی درخواست کی گئی تھی جہاں وہ بارش اور تیز دھوپ سے پناہ لے سکیں۔اس خط میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ وہ اور اس کے دوست رضاکارانہ طور پر بنگلہ بنانے میں مدد کریں گے تاکہ سرکار کو زیادہ پیسے خرچ نہ کرنا پڑیں۔ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ یہ بنگلہ ملک کے سبھی سینیر سیٹزن کا ہو گا۔وزیر اعظم نے اپنی خوشی اور فخر کا اظہار کیا کہ ہمارے ملک میں اب بھی ایسے بزرگ ہیں جو ابھی تک اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں بھلائی کے بارے میں اتنا سوچتے ہیں۔وزیراعظم نے مزید کہا: ” جس روز مجھے یہ خط ملا تھا میں ٹھیک سے سو بھی نہیں پایا تھا اور اگلے ہی روز میں نے یہ حکم دیا کہ اس منصوبے پر کام شروع ہو جائے۔وہ آدمی جس نے یہ خط لکھا تھا وہ آج ہمارے درمیان ہے۔میں نے آج خاص کر اسے اور اس کے ساتھیوں کو یہاں بلایا ہے۔اس منصوبے کو وجود میں لانے کے لئے سب سے بڑا ہاتھ فرید کا ہے میرا نہیں۔فرید صاحب میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ آپ سے گذارش ہے کہ آپ اسٹیج پر تشریف لائیں۔“

تالیاں گونجنے لگیں۔پولیس انسپکٹر فرید کے پاس آیا اور کہا: ” چاچا۔ آپ اسٹیج پر چلئے۔“

فرید رمیش اور دوسرے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا جو خوشی خوشی تالیاں بجا رہے تھے۔

□□□
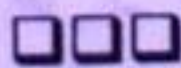
ہمارا بھی زمانہ تھا۔۔اور ہے

(Generation Gap)

اصغر ماموں اپنی جوانی میں فلمیں دیکھنا بہت پسند کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے۔اس زمانے میں دوستوں کے ساتھ سینما ہال میں فلم دیکھنے جانا تفریح کا ایک اہم ذریعہ تھا۔اب ان کے گھر پر بھی سی ڈی پلیئر آگیا ہے۔بیٹا، بہو، بچے اور اصغر ماموں اکثر اتوار کی دوپہرکو فلم دیکھتے ہیں۔

ٹیلی وژن کے بعد ویڈیو پلیئر نے سینما ہال میں جاکر فلم دیکھنے کا رواج کم کر دیاہے۔ اس ویڈیو پلیئر کے بارے میں رائے مختلف ہیں۔کسی کے لئے یہ قیامت قریب ہونے کی نشانی ہے تو کسی کے لئے گناہ کی دلدل میں پھنس جانے کا راستہ ہے۔ مگر اکثر لوگوں کے لئے تفریح یا وقت گذارنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔فلم دیکھنے والوں کے لئے تو یہ بہت ہی فائدہ مند ہے۔ سینما ہال میں جا کر فلم دیکھنے کے بجائے وہ گھر ہی پر فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی اچھی بات ہے کہ گھر کے تمام افراد ایک

ساتھ بیٹھ کر کسی بھی فلم سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

اب سی ڈی اور ڈی وی ڈی کا زمانہ بھی آگیا ہے۔ ایک ڈی وی ڈی میں دو یا چار فلمیں بھی ہوتی ہیں۔ اب سی ڈی پلیئر کی قیمت گھٹ گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر گھروں میں ڈی وی ڈی پلیئر پایا جاتا ہے۔ سی ڈی اور ڈی وی ڈی بھی کم قیمتوں میں دستیاب ہیں۔

دو دن پہلے ان کے بیٹے نے ایک ڈی وی ڈی خریدی جس میں ایک ہی نام کی دو فلمیں تھیں۔ ایک تھی پرانی **دیوداس** جس کا ہیرو دلیپ کمار ہے اور دوسری جس میں شاہ رخ خان نے ہیرو کا رول ادا کیا ہے۔ ان کے پوتے اور پوتی ڈی وی ڈی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ شاہ رخ خان دونوں کا پسندیدہ ہیرو ہے۔ ابھی حال ہی میں ٹی وی پر نئی فلم **دیوداس** آئی تھی۔ اب تو پھر سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔

ایک اتوار کو دوپہر کے کھانے کے بعد اصغر ماموں نے ڈی وی ڈی پلیئر میں پرانی فلم **دیوداس** لگائی۔ بہو اور بیٹے دونوں ان کے ساتھ فلم دیکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ اصغر ماموں نے اپنے پوتے کو آواز دی اور کہا "شکیل جلدی آجاؤ فلم شروع ہو گئی ہے۔ صابرہ سے بھی کہدو کہ وہ جلدی آجائے۔ میں نے دیوداس لگا دی ہے۔ جلدی آجاؤ۔"

شکیل آیا۔ دادا نے اسے پاس بیٹھنے کو کہا۔

" دادا یہ تو دیوداس نہیں ہے۔ یہ کیسی فلم ہے۔ رنگین بھی نہیں ہے۔" شکیل نے کہا۔

"بیٹا، یہ **دیوداس** ہی ہے۔ کہانی ایک ہی ہے مگر یہ فلم پرانی ہے۔تم اس کے ہیرو دلیپ کمار کی ایکٹنگ تو دیکھو۔اداکاری لاجواب ہے۔اس کے ڈائیلاگ سنو۔واہ واہ ۔کیا بات ہے۔ میں نے گیارہ بار یہ فلم دیکھی ہے اور اب بھی دیکھ رہا ہوں تو مجھے بڑا مزہ آرہا ہے۔ہر بار ایکٹینگ کے لحاظ سے مجھے نئ خوبی نظر آجاتی ہے۔ دیکھو، دیکھو۔ہاتھ کے اشارے سے دلیپ کمار نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔" دادانے کہا۔

"لیکن دادا میں نے تو کچھ بھی نہیں سمجھا " شکیل نے کہا۔

"غور سے دیکھنا چاہئے۔" اصغر ماموں نے کہا۔

شکیل کی امی اور اس کے ابو دادا اور پوتے کی باتیں سن کر مسکرا رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے شکیل بیٹھا رہا۔اچانک اس نے کہا" دادا صابرہ ابھی تک نہیں آئی ہے۔ میں اسے بلانے جا رہا ہوں۔"

"جلدی آنا۔ایک بڑا اچھا سین آنے والا ہے۔جلدی آنا۔" اصغر ماموں نے کہا۔

شکیل نے صابرہ کو نہیں بتایا کہ دادا پرانی فلم دیوداس دیکھ رہے ہیں۔صرف یہ کہا: "جلدی کرو۔**دیوداس** دیکھنے چلو۔"

"تم دونوں میرے پاس آ کر بیٹھو۔جب لوگ دلیپ کمار سے ملنے آئیں گے تو دیکھنا وہ کیا کرے گا۔" اصغر ماموں نے کہا۔

صابرہ منہ بناتی رہی اور آخرکار کہا: "یہ تو **دیوداس** نہیں ہے۔ہیرو پتہ نہیں کیسا ہے۔اور ہیروئن کے کپڑے تو دیکھئے ۔ کیسے

بے ڈھنگے ہیں۔ وہ دیکھئے کیسے ایک ہی جگہ کھڑی گا رہی ہے اورناچ بھی رہی ہے۔اس سے ہزار بار بہتر تو مادھوری دکشٹ اور ایشوریارائے ہیں۔''

ماں نے صابرہ کو اشارہ کیا کہ تم چپ رہو اور دادا کو فلم دیکھنے دو۔

صابرہ نے بھی ماں کو اشارہ کیا کہ وہ جانا چاہتی ہے۔ چند ہی لمحے بعد وہ چپکے سے باہر چلی گئی۔ شکیل بھی اس کے پیچھے آیا۔

'' بھیا، یہ ہیرو کون ہے ؟ '' صابرہ نے پوچھا۔

''یہ دادا کے زمانے کا شاہ رخ خان ہے۔'' شکیل نے جواب دیا۔

□□□

آئی پوڈ

ہمارے ملک میں ساٹھ سال کے ہو جانے کے بہت سے فائدے ہیں۔سرکاری پنشن ملتی ہے۔بس میں کہیں جانا ہو، دن میں چاہے کتنی ہی بار کیوں نہ ہو اور کسی وقت بھی تو مفت میں سفر کر سکتے ہیں۔۔یہ الگ بات ہے کہ بڈھوں کو دیکھ کر کبھی کبھار بس رکتی ہی نہیں اور ہاں ان کو لینے کے لئے رک بھی جاتی ہے تو کنڈکٹر یا ڈرائیور کوئی نہ کوئی فقرہ کس دیتا ہے۔ایک بار تو ایسا ہوا کہ دو ضعیف آدمی بس اسٹاپ پر کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک بس آئی ۔کنڈکٹر نے انہیں دیکھ کر کہا ''بس کو روک لو۔ وہ دیکھو، دو ڈائینوسور ''Dinosaur'' کھڑے ہیں۔''

ایک بار میں ایک بس میں تھا۔بس اسٹاپ پر ایک بڈھا آدمی کھڑا تھا جو کافی موٹا تھا۔اسے دیکھ کر کنڈکٹر نے کہا'' اب تو ایک کرین (Crane) لانی ہوگی۔'' اور جب وہ آدمی بس میں چڑھنے لگا تو کنڈکٹر نے ڈانٹ کر کہا: '' جلدی نہیں کر سکتے'' وہ بیچارا ہانپتے ہوئے بس میں داخل ہوا اور ابھی وہ بیٹھا بھی نہیں تھا کہ

ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کردی۔ وہ آدمی گرتے گرتے بچا۔

بہرحال ہم دو تین دوستوں نے یہ طے کیا کہ کنڈکٹر کچھ بھی کہے ہم بس سے ضرور سیر کرنے جائیں گے۔آخرکار بس والے ہمیں مفت میں تھوڑی ہی لے جاتے ہیں۔ سرکار اس کے لئے پیسے دیتی ہے۔جوانی میں کام سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی مگر اب تو فرصت ہی فرصت ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں سے ہم سنتے آئے ہیں کہ سفرکرنے سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں بلکہ یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم کتنی چیزوں سے ناواقف ہیں۔کبھی تو اپنے آپ کو جاہل بھی سمجھ بیٹھتے ہیں۔

معمول کے مطابق میرے دوست اور میں بس اسٹاپ پہ ملے۔

"آج کہاں چلنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔تم ہی بتاؤ۔"میں نے جواب دیا۔

"کل میرے ایک پوتے نے بتایا کہ روزہل میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں بہترین دال پوری ملتی ہے جو بہت ہی لذیذ ہوتی ہے۔" میرے دوست نے کہا۔

"تو پھر وہیں چلتے ہیں۔وہاں پہنچ کر ڈھونڈ لیں گے کہ وہ دال پوری کہاں ملتی ہے۔کھائیں گے، ٹہلیں گے اور واپس آجائیں گے۔"میں نے کہا۔

پوچھتے پوچھتے ہم اس دال پوری کی دکان پر پہنچے۔کافی بھیڑ تھی مگر لوگ قطار میں کھڑے تھے۔ اس دکان کی ایک اچھی بات یہ ہے کہ وہاں بیٹھنے کی جگہ ہے جہاں ہم نے گرم گرم دال

پوریاں مزیدار ترکاریوں اور چٹنی کے ساتھ خوب کھائیں۔

''تمہارے پوتے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بہت لذیذ ہے یہاں کی دال پوری۔'' میں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔

روز ہل میں گھومنے پھرنے کے بعد ہم دونوں بس اڈے پر گئے اور پورٹ لوئیس لوٹنے کے لئے بس میں ایک دوسرے کی بغل میں بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر بعد بس چل پڑی۔ کچھ فاصلے پر بس ایک بس اسٹاپ پر رکی۔وہاں ایک ہی اسکول کے یونی فارم پہنے بہت سے طالبِ علم کھڑے تھے۔وہ بس میں داخل ہوئے۔اپنی اپنی جگہ پہ بیٹھ گئے۔نہ کوئی ایک دوسرے سے بات چیت کر رہا تھا اور نہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھ رہا تھا۔ہمارے زمانے میں ہم تو دوستوں سے بات چیت کرتے تھے یا کتاب پڑھتے تھے۔

'' لگتا ہے کہ یہ طالبِ علم بہت مہذب ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، لیکن اس عمر میں طالبِ علموں کا چپ رہنا عجیب سا لگ رہا ہے۔''

'' شاید یہ بہرے ہیں ۔دیکھو ان کے کانوں میں سننے کا ایک آلہ لگا ہوا ہے۔''

'' واقعی تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ہاں یاد آیا ۔بوباسیں میں کم یا نہ سننے والے بچوں کا ایک اسکول ہے جو ادھر ہی کہیں ہے۔شاید یہ طالبِ علم اسی اسکول کے ہیں۔''

'' مجھے تو ان کو دیکھ کر بہت افسوس ہو رہا ہے۔ان کے والدین کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔خدا ان پر رحم کرے۔''

اتنے میں کنڈکٹر آ گیا۔اس نے ہمیں سلام کیا۔ہم نے اپنے اپنے کارڈ دکھایئے۔ میں نے اس سے پوچھا" کیا یہ طالبِ علم بہروں کے اسکول کے ہیں؟"

" آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" کنڈکٹر نے کہا۔

" دراصل ہمیں ان کو دیکھ کر بہت افسوس ہو رہا ہے۔دیکھیے ان کے کانوں میں سننے کا آلہ لگا ہوا ہے۔"میں نے کہا۔

کنڈکٹر مسکرایا "چاچا یہ آلہ جو دیکھ رہے ہیں یہ بہروں کا نہیں ہے۔وہ اپنے آئی پوڈ یا "mp3" سے اپنے اپنے پسند کے گانے سن رہے ہیں" اس نے کہا اور دوسرے مسافروں کے پاس چلا گیا۔

" آئی پوڈ"یا "MP3" کیا ہوتا ہے؟" میرے دوست نے پوچھا۔

"پتہ نہیں میں نے تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔"میں نے کہا۔

" ہم پورٹ لوئس جا ہی رہے ہیں ۔وہاں کسی دکان میں جا کر پوچھ لیں گے۔"میرے دوست نے کہا۔

" اور اگر سستا ملا تو میں ایک خرید لوں گا۔" میں نے کہا۔

"اس میں ہمارے زمانے کے گانے نہ آئے تو؟" میرے دوست نے پوچھا۔

" یہ تو ایک مسئلہ ہے۔تم نے ٹھیک ہی کہا۔" میں نے جواب دیا۔

بس سے اترے تو سیدھے ایک ایسی دکان میں گئے جہاں

ٹیلی وژن، فرتج اور نہ جانے طرح طرح کی کتنی چیزیں بکتی ہیں۔ہمیں دیکھتے ہی ایک لڑکی ہمارے پاس آئی اور کہا: ''آیئے آیئے میں آپ دونوں کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔''

اس کے کہنے کے انداز سے ہمیں ہمت ہوئی کہ ہم اس سے آئی پوڈ کے بارے میں پوچھیں۔ اس نے ہمیں فوراً تین چار ماڈل دکھائے۔ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ اس سے گانے سن سکتے ہیں۔مگر کیسے؟ ہماری دلچسپی دیکھ کر لڑکی نے ایک آئی پوڈ نکالا اور میرے ہاتھ میں تھمایا۔دو انچ لمبا ایک انچ چوڑا اور ایک انچ موٹا یہ چوکور آلہ دیکھ کرہم سوچنے لگے کہ اس سے گانے کیسے آئیں گے لیکن لڑکی نے ایر فون نکالا اورایک سرا آئی پوڈ سے لگایا اور ایر فون میرے کانوں میں لگایا۔ فرانسیسی گانے سنائی دینے لگے۔

'' میں نہیں لوں گا۔اس میں تو پرانے ہندوستانی فلمی گانے نہیں آ رہے ہیں۔ہم تو وہی گانے سننا پسند کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

'' وہ تو بہت ہی آسان ہے۔ آپ اس میں اپنی پسند کے گانے ریکارڈ کروا لیجیے۔'' لڑکی نے کہا۔

''ہم کیسے ریکارڈ کروائیں گے۔'' میں نے پوچھا۔

'' کیا آپ کے بیٹے یا پوتے پوتیوں کے پاس کمپیوٹر ہے؟ اگر آپ ان سے کہیں گے تو وہ آپ کے لئے ریکارڈ کر دیں گے۔ مگر آپ کو اپنی پسند کے پرانے فلمی گانے خود ہی ڈھونڈ کر لانے ہونگے۔'' لڑکی نے کہا۔

"یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔میں پرانے ریکارڈ نہیں خرید سکتا اور وہ کہاں ملیں گے؟" میں نے کہا اور جانے لگا۔اتنے میں لڑکی نے ہمیں پھر بلایا اور کہا۔ "دیکھئے آپ یہ سیل ٹیلیفون لے لیجیے اس سے بھی آپ گانے سن سکتے ہیں، فوٹو لے سکتے ہیں اور آرام سے فون بھی کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ اس سے کئی اور کام لیے جا سکتے ہیں۔"

'کیا اس میں بھی وہی کان میں ڈالنے والا آلہ استعمال کرنا چاہیے؟" میں نے پوچھا

"جی ہاں آپ اکیلے سن سکتے ہیں۔" لڑکی نے کہا۔

"اور میرا دوست کیا کرے گا۔ گانے کا لطف میں اکیلے ہی اٹھاؤں اور وہ مجھے دیکھتا ہی رہے۔ نہیں مجھے ایسی چیز نہیں چاہیے۔ اس سے بہتر تو میرا ریڈیو کیسٹ ہے۔جب میں اسے لگاتا ہوں تو جتنے لوگ چاہیں سن سکتے ہیں ۔آئی پوڈ اور ٹیلی فون کی طرح نہیں کہ جو میں سن رہا ہوں وہ دوسرے کو سننے نہ دوں اور صرف میں ہی لطف اٹھاؤں۔"

اس دکان کا منیجر ہمارے قریب آکر ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

"چاچا زمانہ بدل گیا ہے۔"

"ہمارے لئے نہیں۔" میں نے کہا۔

□□□
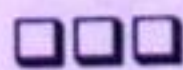
کریم چاچا

''بھائی اس مسجد کو برباد ہونے نہیں دوں گا۔'' کریم چاچا کے ان لفظوں سے ایک کرب اور بڑی تکلیف کی ترجمانی ہو رہی تھی۔'' میں اس نالائق مجید کے ہاتھوں سے اس مسجد کو لے کر رہوں گا۔ مانا کہ میں بدکار ہوں، گنہگار ہوں۔ اس وقت میرے ہاتھ میں سگریٹ رہے مگر میں اس آگ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنی ساری دولت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے واسطے لٹا دوں گا اور اس مسجد کو اس جاہل سے نجات دلا دوں گا۔
'' یہ کہتے کہتے کریم چاچا بہت جذباتی ہو گئے۔

کریم چاچا اس وقت اپنے پیسے کے نشے میں یہ بات نہیں کہہ رہے تھے۔ یہ ان کے دل کی آواز معلوم ہو رہی تھی۔

'' لیکن کریم چاچا آپ ان جھگڑوں میں کیوں پڑ رہے ہیں؟'' میں نے کریم چاچا سے پوچھا۔

آنس لانغے کی اس چھوٹی سی مسجد میں جو بربادی کے آثار کریم چاچا کو نظر آ رہے تھے وہ بہت سے لوگوں کو نظر نہیں آئے۔ اس مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت کم ہوا کرتی ہے۔ ایک

امام کو مقرر کر دیا گیا تھا جو بیک وقت امام اور موذن تھا۔ اس کے علاوہ جھاڑو دینے کی خدمت بھی انجام دیتا تھا۔ فجر ، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں دس پندرہ لوگ آ ہی جاتے تھے مگر ظہر اور عصر کی نمازوں میں صرف دو یا تین نمازی ہوتے تھے۔البتہ جمعہ کی نماز کے لئے تین چار صفیں ہوتی تھیں۔گاؤں کے تقریباً ڈیڑھ سو مسلمانوں کی طرف سے ہر مہینہ ساٹھ روپے مسجد کے لئے مل جاتے تھے۔ کریم چاچا بجلی اور پانی کے بل ادا کر دیتے تھے۔امام صاحب کے لئے وقف بورڈ کی طرف سے تنخواہ مل جاتی تھی۔اگرکسی خاص کام کے لئے اخراجات زیادہ ہو جاتے تو پورٹ لوئس کے نامور مسلمان تاجروں سے رمضان کے مہینے میں چندہ وصول کر لیتے تھے۔

"بھائی آپ کو تو معلوم نہیں ہے کہ ہم نے اس مسجد کی تعمیر میں کتنی پریشانیاں اٹھائی ہیں مگر آپ کے مرحوم والد صاحب کو اچھی طرح سے معلوم تھا۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔۔۔۔۔"

قطع کلام کرتے ہوئے میں نے کہا "کریم چاچا۔میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ کس طرح آپ کی مسجد برباد ہو رہی ہے۔'

"یہ بات گاؤں میں رہنے سے ہی معلوم ہوتی ہے۔" کریم چاچا نے جواب دیا۔

آنس لا نغے کی یہ مسجد زیادہ پرانی نہیں ہے۔پتھر کی دیواروں اور ٹن کی چھت والی بغیر گنبد کی اس مسجد کے بنانے

میں آنس لاغے کے ہر مسلمان مرد نے حصہ لیا تھا۔دوسرے علاقوں سے بھی چندہ وصول کیا گیا تھا۔کریم چاچا نے نہ صرف ایک بڑی رقم دی تھی بلکہ سب لوگوں کے ساتھ مل کر مسجد کی تعمیر میں بھی ہاتھ بٹایا تھا۔جب مسجد بن کر تیار ہوئی تو وقف بورڈ نے آنس لاغے کے مسلمانوں سے ایک متولی کے انتخاب کی مانگ کی ۔اس مسجد کا متولی آنس لاغے کی واحد جماعت کے سردار بھائی اکرم کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ اکرم کے والدصاحب رحمان بھی اس جماعت کے سردار رہ چکے تھے۔رحمان صاحب کے انتقال کے بعد لوگوں نے اکرم کو سردار بنایا تھا۔ اکرم نے مسجد کی دیکھ بھال میں کوئی کمی نہیں کی۔ان کے اچانک انتقال کے بعد گاؤں والوں نے یہی سوچا کہ ان کے لڑکے مجیدکو متولی بنایا جائے کیونکہ ان کو پوری امید تھی کہ وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چل کرمسجد کی دیکھ بھال ٹھیک سے کرے گا۔

اکثر آنس لاغے سے گذرتے ہوئے نماز کے وقت میں وہیں رک جاتا اور مسجد میں نماز ادا کر لیتا تھا۔ میرے والد مرحوم یہیں کے باشندے تھے ۔میں ان کے دوستوں سے ملاقات کرنا اوران کی خیریت معلوم کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ایک روز جب مغرب کی نماز کے بعد گھر واپس آیا تو مسجد کی بربادی پر کریم چاچا کے آنسو بہانے کے بارے میں سوچتا رہا۔مجھے مسجد کی بربادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔مسجد میں نمازی برابر آتے رہتے تھے۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ مسجد کی چٹائیاں پرانی ہو گئیں تھیں اور بارش میں کہیں کہیں سے چھت سے پانی بھی ٹپکتا تھا۔ ایک

ناقابل قبول بات یہ ہوئی تھی کہ مسجد کے سامنے ایک شراب خانہ کھل گیا تھا۔ اور وہاں پر مسلمان بھی شراب پینے جانے لگے تھے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ دن بہ دن زیادہ مسلمان شراب پینے لگے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد میں نمازی کم ہونے لگے اور شراب خانے میں مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔رفتہ رفتہ مسجد کے لئے جو رقم وہ دیتے تھے وہ شراب خانے میں صرف ہونے لگی۔ایسی حالت میں اور اس مہنگائی کے زمانے میں مجید کے لئے چٹائیاں خریدنا اور چھت کی مرمت کروانا آسان نہیں تھا۔

ایک روز پورٹ لوئس میں میری ملاقات مجید سے ہوگئی۔اس نے مجھے بتایا کہ گاؤں والوں نے متولی کے لئے الیکشن کی مانگ کی ہے۔یہ الیکشن دو ہی ہفتوں میں ہونے والا ہے۔کریم چاچا تو خود امیدوار تو نہیں تھے مگر انہوں نے اپنے بھانجے کو امیدوار کھڑا کیا ہے۔دوسرا امیدوار مجید نہیں تھا بلکہ رشید نامی ایک عمر رسیدہ میرے والد کے دوست تھے جنہیں میں مسجد میں اکثر دیکھتا تھا۔

الیکشن سے ایک روز پہلے میں محض اس غرض سے گیا کہ وہاں الیکشن کی تیاریاں دیکھوں۔مسجد میں مغرب کی نماز کے بعد رشید صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے اپنا فرض سمجھ کر اس الیکشن میں اپنی امیدواری پیش کی ہے۔انہوں نے کوئی پارٹی نہیں بنائی ہے مگر خود لوگوں نے ان کے لئے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

"یہ الیکشن مسجد کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے ہے۔ ہم نے اپنی جماعت سے ان لوگوں کو نکال دیا ہے جو شراب پیتے

ہیں۔یہی لوگ اب ہمارے مخالف بن گئے ہیں۔" رشید صاحب نے کہا۔
شراب خانہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔کوئی "سیگا" گاتے ہوئے ناچ رہا تھا تو کوئی سر پر ٹوپی رکھے ہوئے یا سر پر رومال باندھے ہوئے کریم چاچا کا نعرہ لگا رہا تھا۔ میں شراب خانے کے سامنے اپنی گاڑی میں بیٹھے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اس خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس گاؤں کے مسلمانوں کو شراب سے اتنی محبت کیوں ہوگئی ہے۔اچانک میں نے ایک شخص کو سر پر لال ٹوپی پہنے ہوئے ،نشے میں چور اور جھومتے ہوئے آتے دیکھا۔وہ ہر ایک سے پوچھ رہا تھا کہ تم کس کو ووٹ دو گے۔اس کو یہی جواب ملتا: "کریم چاچاکو۔"وہ یہ سن کر جواب دینے والے سے بغلگیر ہوتا اور اس کی پیشانی چوم لیتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ رشید صاحب کو چند صلواتیں سناتا تھا۔
کریم چاچا کے گھر کے سامنے ایک بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اس میں کھانے پینے کا انتظام ہو رہا تھا۔پانچ دیگوں میں بریانی تیار ہو گئی تھی ۔یہ ان کے لئے تھی جو شراب خانے سے نکل کر شامیانے میں جا رہے تھے ۔وہاں پر کریم چاچا ہر ایک سے کہتے کہ کل بھی تمھیں کچھ دیا جائے گا۔لفظ "کچھ" پر غور کیا تو مجھے اس کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا کہ کریم چاچا یہ کہنا چاہتے تھے کہ کل تمھیں پیسے بھی ملیں گے۔
اس الیکشن کے بارے میں کچھ نہ سننے کے لئے میں نے دو تین مہینوں تک آنس لانغے کی طرف جانا ہی بند کر دیا تھا۔ایک بار جب ادھر سے گذرا تو مسجد کی شکل ہی بدل گئی تھی۔نہ

صرف رنگ چڑھا دیا گیا تھا بلکہ اس پر ایک نئی چھت نظر آ رہی تھی۔ نماز کے لئے اندر گیا۔قیمتی قالین بچھی ہوئی تھی اور چھت پر پنکھے بھی لگے ہوئے تھے۔یہ سب کچھ دیکھ کر میرے دل میں جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ میں نے کریم چاچا کے بارے میں غلط باتیں سوچی تھیں۔مجھے خود پر غصہ آرہا تھا کہ میں نے اس شخص کے بارے میں کیوں غلط سوچا تھا۔جی چاہتا تھا کہ جا کر ان سے معافی مانگوں۔واپسی پر راستے بھر سوچتا رہا کہ کس طرح خدا نے کریم چاچا کو موقع فراہم کیا کہ وہ مسجد کی بہتری کے لئے کام کریں۔ میں نے یہ طے کیا کہ کریم چاچا کی اپنے غریب خانے پر دعوت کروں گا کیونکہ ایسے لوگوں کی خدمت کرنا باعث ثواب ہے۔

گذشتہ جمعے کی نماز کے لئے میں آنس لا غے کی مسجد گیا تھا مگر جو زیادہ اہم کام وہاں تھا وہ تھا کریم چاچا کو اپنے گھر پر آنے کی دعوت دینا۔

خطبہ کا وقت ہو ہی گیا تھا۔مسجد میں امام صاحب کے علاوہ ایک آدمی اور صرف میں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس مسجد میں صرف ہم تین ہی تھے جبکہ اس سے پہلے گاؤں کے کافی لوگ آ جاتے تھے۔کم سے کم دو تین صفیں تو ضرور ہوتی تھیں۔ زور سے السلام علیکم کی جب آواز آئی تو مجھے تسلی ہوئی۔مسجد میں نووارد کریم چاچا تھے۔ان کو دیکھتے ہی امام صاحب ان سے ملے۔

"اسی بات کی فکر کر رہے ہیں۔آپ اور دو منٹ انتظار کر لیجیے پھر خطبہ شروع کردیجیے۔" یہ کہہ کر کریم چاچا مسجد سے

باہر نکلے۔

دو منٹ بعد کریم چاچا ایک شخص کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔امام صاحب مجھے دیکھ رہے تھے۔میں سمجھ گیا کہ وہ چاہتے تھے کہ میں اذان دوں اور وہ خطبہ شروع کریں۔ خطبے کے بعد میں نے اقامت دی اور امام صاحب جمعے کی نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔جب ہم پہلی رکوع میں گئے تو کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔جب نماز ختم ہوئی تو دیکھا کہ وہ شخص جو کریم چاچا کے ساتھ آیا تھا وہ نیچے گرا پڑا ہوا تھا۔میں جلدی سے اسے اٹھانے کے لئے جھکا تو اس کی منہ سے بدبو آرہی تھی۔میں نے کریم چاچا کی طرف مڑ کر دیکھا تو انہوں نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔"مجھے کیا معلوم کے اس نے اتنی شراب پی ہے۔ میں نے اسے صرف دو پیگ دیے تھے اور یہ مسجد آنے کے لئے تیار ہونے چلا گیا تھا۔ شاید اس نے میرے لڑکے سے خرید کر اور زیادہ پی لی ہوگی۔"

"کریم چاچا یہ شراب خانہ آپ کا ہے؟" نہ جانے یہ جملہ میری زبان سے کیسے کیسے نکل گیا۔

"ہاں ۔جی ہاں۔بھئی اب تو میں ضعیف ہو گیا ہوں۔کام آسان ہے اور آمدنی بھی اچھی ہے۔" کریم چاچا نے کہا۔

یہ سن کر مجھے وہ کریم چاچا نظر آنے لگے جنہوں نے کہا تھا کہ وہ اس مسجد کو کسی صورت میں برباد نہیں ہونے دیں گے۔

□□□

لاوارث قبر

فرانس کا ایک شہر ہے۔ اس کا نام کالے (Calais) ہے۔ یہ شہر کئی اعتبار سے مشہور ہے۔ فرانس کے شمالی مغربی حصہ میں واقع یہ شہر انگلینڈ سے سب سے قریب جگہ مانی جاتی ہے۔ رات کے وقت جب موسم صاف ہوتا ہے تو کالے سے انگلینڈ کے شہر ڈوور (Dover) کی روشنیاں نظر آتی ہیں۔ مگر کالے اور ڈوور کے درمیان سمندر ہے جسے انگلش چینل یا فرنچ میں لا مانش (La Manche) کہا جاتا ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان فیری بوٹ کے ذریعہ رابطہ رہتا ہے۔ یہاں کے فیری بوٹ دراصل بڑے بڑے بحری جہاز ہیں جو ہر گھنٹے ایک شہر سے دوسرے کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ اس میں مسافروں کے علاوہ موٹر کاریں، مال سے لدے ٹرک اور سیاحوں کی بسیں یا کوچ بھی ہوتے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کا سفر بڑے مزے میں ڈیک پر پورا ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر موسم خراب ہو یا بہت سردی پڑ رہی ہو تو اندر جہاز کے لاؤنج میں رہنا پڑتا ہے۔

کالے ہی میں دنیا کا ایک بہت اہم ٹنل (tunnel) یعنی

بڑی سرنگ ہے۔ سمندر کی تہہ پر جو زمین ہے اس کے اندر یہ ٹنل بنایا گیا ہے۔ یہ تقریباً پچیس میل کا ہے۔ اس میں لندن سے پیرس یا بروسل (Brussel)، بلجیم کا دارالسلطنت، آنے جانے کی تیز رفتار والی ٹرین ''تے ژے وے'' رات دن آتی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص قسم کی ٹرین بھی ہے جو کار اور بسوں کے لئے ہے۔ اگر آپ اپنی کار سے فرانس سے انگلینڈ جانا چاہتے ہیں تو آپ انٹرنیٹ کے ذریعہ ٹکٹ بک کرالیجئے اور کالے کے مضافات میں پائے جانے والے اس خاص اسٹیشن پر پہنچ جائیں جہاں آپ اپنی کار ڈرائیو کرتے ہوئے ٹرین میں داخل ہو جائیں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹرین روانہ ہوتی ہے۔ دو تین منٹ کے بعد آپ ٹنل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آپ چاہیں تو آپ اپنی گاڑی میں بیٹھے رہیں یا کینٹین میں چلے جائیں۔ مگر یہ سفر تیس یا پینتیس منٹ کا ہوتا ہے اور اب آپ ایک دوسرے ملک میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ گاڑی چلا رہے ہوں تو بہت احتیاط کرنی پڑے گی۔ فرانس میں بائیں طرف گاڑی چلاتے ہیں اور انگلینڈ میں دائیں طرف۔

لندن میں میرا ایک فرانسیسی دوست ژاں میرے برابر کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ صبح ہم دونوں ایک ہی انڈرگراونڈ ٹرین سے اپنے اپنے دفتر جاتے ہیں۔ تقریباً ہر ویک اینڈ (week end) کے لئے وہ کالے جاتا ہے جہاں اس کی ماں رہتی ہے۔ سنیچر کی صبح سویرے وہ اپنی کار سے ڈوور شہر کی طرف جاتا ہے جس روز فیری بوٹ کا کرایہ کم ہوتا ہے وہ ڈوور کی بندرگاہ جاتا ہے اور اگر

ٹرین کا کرایہ کم ہو تو وہ ڈوور سے پہلے ہی مڑ جاتا ہے اور اس اسٹیشن کی طرف جاتا ہے جہاں اپنی کار کے ساتھ وہ ٹرین میں داخل ہوتا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ کالے پہنچ جاتا ہے اور دس منٹ بعد وہ اپنی ماں سے جا کر ملتا ہے۔ کئی بار ژاں مجھے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

کالے پہنچتے ہی ایک الگ ماحول ملتا ہے۔ یہاں گاڑی بائیں طرف چلائی جاتی ہے۔ لوگ فرانسیسی زبان بولتے ہیں۔ گنے چنے لوگ انگریزی بول یا سمجھ سکتے ہیں۔ چائے کی جگہ کافی پیتے ہیں اور وسکی کی جگہ وائن۔ یہاں کی پیسٹری کا جواب نہیں۔ خریدتے وقت احتیاط رکھنی چاہیے کہ اس میں رم یا شراب نہ ہو۔ مگر یہاں کے لوگ بھی انگریزوں کی طرح گورے ہوتے ہیں۔ یہاں پر بھی مشترکہ خاندان نہیں ہے۔ یہاں بھی اٹھارہ بیس سال میں لڑکے لڑکیاں اپنے ماں باپ کے گھر چھوڑ کر الگ رہنے کے لئے ایک کمرہ یا اسٹوڈیو کرائے پر لے لیتے ہیں۔ مگر ژاں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا اور صرف اسی وقت ماں سے الگ رہنے لگا جب اس کا تبادلہ لندن میں ہوگیا۔ دراصل وہ دوسروں کی طرح ماں سے الگ نہیں ہوا ہے۔ چار یا پانچ دن لندن میں گزار کر اپنی ماں کے فلیٹ میں آجاتا ہے۔ اس کے کئی دوست اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ابھی تک اس نے اپنی آزادی نہیں لی ہے۔

مگر ژاں ہمیشہ اپنی ماں کے فلیٹ میں رہنا مناسب سمجھتا تھا۔ وہ اس لئے کہ وہ اپنی ماں کو اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ژاں کے باپ نے ماں اور تین بچوں کو چھوڑ کر ایک دوسری

عورت کے ساتھ گھر بسا لیا تھا۔ بیوی کو طلاق دے دی مگر ایلی مونی بھی نہیں دیا کیونکہ وہ خود بےروزگار تھا۔ ماں نے بہت مشکل سے تین بچوں کو پالا پوسا۔ فرانس میں تعلیم مفت ہے۔اس کے باوجود غریب طالب علموں کو اپنے اخراجات کے لئے وظیفے ملتے ہیں۔ ژاں کی بہن ژاکلین اور بھائی آلفرید کالے چھوڑ کر پیرس چلے گئے جہاں یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اعلیٰ تعلیم کے بعد دونوں الگ الگ شہروں میں ملازمت کرنے لگے۔ ژاں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ماں کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں تعلیم کے لئے جائے اسی لئے وہ کالے ہی میں رہا اور تعلیم کے بعد اسے وہیں پر ایک ایسی کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کی ایک شاخ لندن میں بھی تھی۔ تین برس کے بعد اسے انگلینڈ کے آفس میں ایک سال کے لئے بھیج دیا گیا۔ شروع شروع میں اس نے انکار کر دیا اور ملازمت سے استعفا دینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر ماں کو بتایا اور ماں نے اسے سمجھایا کہ اسے تبادلہ منظور کر لینا چاہیے۔ ژاں نے بتایا کہ وہ ماں کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتا تو ماں نے کہا کہ پڑوس میں اس کی سہیلیاں رہتی ہیں۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور پھر لندن زیادہ دور نہیں ہے۔ ہر ہفتہ وہ آسکتا ہے۔

پہلی بار جب میں ژاں کی ماں سے ملا تو وہ بڑی محبت سے ملیں اور میرا شکریہ بھی ادا کیا کہ میں ژاں کا اتنا خیال رکھتا ہوں۔وہ بہت اچھی تھیں۔

"میں ژاں کے بارے میں ہمیشہ پریشان رہتی ہوں۔ زیادہ

انگریزی بھی نہیں جانتا، کھانا پکانا بھی نہیں آتا اور نہ کپڑے سلیقے سے رکھنا آتا ہے۔ اچھا ہوا کہ تم اسے مل گئے۔ بیٹا بتاؤ تم نے فرنچ کہاں سیکھی۔'' ماں نے پوچھا۔

'' اِل مورِیس میں۔'' (جزیرہ ماریشس میں)۔ میں نے جواب دیا۔

'' اچھا اچھا یہ تو بہت خوبصورت جزیرہ ہے مگر ہے بہت دور۔ ایک زمانے میں یہ فرانس کی ایک کالونی تھی۔'' ماں نے کہا۔

واپسی پر جہاں انہوں نے ژاں کے لئے کھانے پینے کی چیزیں دیں وہاں میرے لئے بھی پیسٹری ،کیک اور کئی اور چیزیں دیں اور کہا ''اگلے ہفتے ضرور آنا۔''

غریب الوطنی میں یہی چھوٹی چھوٹی باتیں دل کو چھو لیتی ہیں۔راستے بھر ژاں اپنی ماں کے بارے میں بات چیت کرتا رہا۔

اگلے مہینے ژاں نے مجھے پھر سے اپنے ساتھ کالے چلنے کو کہا۔ جب اس کی ماں سے ملا تو انہوں نے مجھ سے پھر وہی سوال کیا کہ میں نے فرانسیسی زبان کہاں سیکھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے بتایا کہ اِل مورِیس میں، تو پوچھنے لگیں کہ یہ ملک کہاں ہے۔

اس بار ہم ٹنل میں تھے کہ ژاں گاڑی سے اترا اوربسکٹ لینے کے لئے گاڑی کی ڈگی کھولی تو بسکٹ کا کوئی پیکٹ نہیں تھا۔ البتہ چار پیکٹ نمک اور دو پیکٹ شکر کے نظر آئے۔

'' حیرت ہو رہی ہے۔ ماں نے کبھی ایسی غلطی نہیں کی

ہے۔" ژاں نے کہا۔

" مجھے بھی کل حیرت ہوئی تھی جب انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے فرانسیسی زبان کہاں سیکھی ہے۔" میں نے کہا۔

دو مہینوں کے بعد ژاں نے بتایا کہ اس کی ماں بہت بھولنے لگی ہیں۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے مشورہ دیا کہ اس کے پاس کسی کو رہنا چاہیے۔ ایلزائمر کے اثرات نظر آنے لگے تھے۔

"ہم ایلزائمر کے بارے میں اتنا پڑھتے ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہ ماں کا کیا ہوگا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں جلد سے جلد کالے میں تبادلہ کروا لوں تاکہ ماں کے پاس رہ سکوں۔" ژاں نے کہا۔

اس نے درخواست بھیجی۔ اسے بتایا گیا کہ تبادلہ تو فوراً نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی جگہ پر دوسرے افسر کو آنے میں کم سے کم چار ہفتے لگ جائیں گے۔

" مجھے تو ایک مہینہ کی چھٹی مل سکتی ہے۔ میں ماں کے پاس رہ سکتا ہوں اور اس کی دیکھ بھال بھی کر لوں گا۔" میں نے کہا۔

" تمہاری چھٹی برباد ہو جائے گی۔ پھر بھی تمہاری مدد کے لئے بہت بہت شکریہ۔" ژاں نے کہا۔

ضد کر کے اگلے ویک اینڈ میں ژاں کے ساتھ کالے پہنچا۔ اس بار ماں نے مجھے پہچان لیا مگر کہا:" تم کالے ہی میں کام کرتے ہو۔" ان کی بات چیت سے لگ رہا تھا کہ بہت کچھ بھولتی جا رہی ہیں۔

پھر ماں کچن میں کھانا پکانے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بلایا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے کھانے میں نمک ڈالا ہے یا نہیں۔ میں نے چکھ کر بتایا کہ نمک ہے۔

تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ژاں نے فون اٹھایا۔ اس کی بہن ژاکلین تھی۔ بھائی سے بات چیت کرنے کے بعد ماں سے بات کرنی چاہی۔ ژاں نے ماں کو پکارا اور کہا کہ ژاکلین بات کرے گی۔

"کون ژاکلین؟ میں تو کسی ژاکلین کو نہیں جانتی ہوں۔" ماں نے کہا۔

"ماماں ژاکلین ہے۔ آپ کی بیٹی۔ میری بہن۔ یاد آیا۔" ژاں نے کہا۔

ماں کو یاد آگیا۔ فون پر اپنی لڑکی سے بات چیت کرتے وقت اس سے پوچھا کہ امتحان کا نتیجہ آگیا ہے۔ ژاکلین نے بتایا کہ اس کے امتحان کا نتیجہ پانچ سال پہلے آگیا تھا اور اب وہ کام بھی کر رہی ہے۔ پھر ماں نے فون رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر سے فون کی گھنٹی بجی۔ ژاکلین تھی۔ ژاں نے بتایا کہ کس طرح ماں دن بہ دن زیادہ بھولتی چلی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا ہے اور ڈاکٹر نے مشورہ دیا ہے کہ ماں کے پاس کسی کو رہنا ضروری ہے۔

"میں تو نہیں آسکتی۔ مجھے چھٹی نہیں ملے گی۔ تم کالے واپس آجاؤ۔" ژاکلین نے کہا۔

"تم فکر مت کرو۔ میرا دوست آیا ہوا ہے۔ ایک مہینہ

کے لئے وہی ماما کے پاس رہے گا۔" ژاں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

اتوار کو جب ژاں گاڑی میں اپنا سامان رکھنے لگا تو ماں نے اس سے پوچھا "بیٹا میں کیوں اتنا بھولنے لگی ہوں۔ مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔" اور ماں رونے لگی۔

"ماما فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا دوست تمہارے پاس رہے گا۔ جلد ہی کالے میں میرا تبادلہ ہو جائے گا۔ تب میں تمہارے ہی ساتھ رہوں گا۔" ژاں نے کہا۔

"تو تم ابھی کہاں کام کر رہے ہو؟" ماں نے پوچھا۔

ژاں ہکا بکا رہ گیا۔ ماں کو کچھ نہیں کہا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے ماں کو بتایا کہ ژاں لندن میں کام کر رہا ہے۔

گرمی کا زمانہ تھا۔ سورج تقریباً دس بجے غروب ہوتا تھا۔ فرانس کے لوگوں کے لئے ایسے موسم میں گھر سے باہر رہنا اچھا لگتا ہے۔ لوگ موسم سے فائدہ اٹھا کر ٹہلنے جاتے ہیں یا جاگنگ کرتے ہیں یا باغ میں جا کر پکنک مناتے ہیں یا سائکلنگ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ راستے میں لوگ ہلکے پھلکے کپڑے پہنے اور بعض جسم کی نمائش کرتے نظر آتے ہیں۔ میں ماں کو باہر ٹہلنے کے لئے لے جاتا تھا۔ وہ مجھ سے اکثر وہی سوال کرتی تھیں جو ایک روز پہلے کر چکی تھیں مگر میں ان سے نئے نئے سوالات کرتا تھا تاکہ وہ اپنی یادداشت پر قابو رکھیں۔

لندن کی طرح یہاں کے سینیر سیٹزن یعنی بڈھے لوگ سپر

مارکٹ روزانہ جاتے ہیں۔ اصل وجہ خریداری کرنا نہیں ہے بلکہ گھر کی چار دیواری سے نکلنا ہے۔ وہاں ایک یا دو چیزیں خرید لیتے ہیں اور دوست احباب سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ میں بھی دن میں ماں کو اکثر سپرمارکٹ لے جاتا تھا۔ بڑے شاپنگ سنٹر میں لے جانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھیڑ میں کھو نہ جائیں۔ کاغفور سپرمارکٹ کے وہ عادی تھیں۔ اسی لئے میں انہیں وہاں لے جاتا۔ ایک دو بار اوشاں (Auchan) بھی لے گیا تھا مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں کاغفور ہی پسند ہے۔ میں ان کو ان کی اپنی پسند کی چیزیں خریدنے دیتا تھا۔ اکثر وہ وہی چیزیں خریدتی تھیں جو پہلے روز خرید چکی تھیں۔ کبھی کبھار ان کو بتاتا تھا کہ یہ چیزیں گھر پر ہیں۔

ایک دن کاغفور میں وہ شیلف سے روٹی لے رہی تھیں کہ ایک عورت نے انہیں سلام کیا۔ ماں نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئیں۔ اس عورت نے ماں کے نام سے پکارا مگر ماں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں آگے بڑھا اور اسے بتایا کہ ماں کی حالت کیسی ہوگئی ہے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ضد کر کے ماں سے پوچھا: ''تم مجھے جانتی ہو۔ میرا نام کیا ہے؟'' ماں اسے دیکھتی رہی اور کہا: ''تم کون ہو؟'' اس عورت کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور مجھ سے کہا: ''اس کا اچھی طرح سے خیال رکھنا۔ یہ میری بہت پیاری سہیلی ہے۔ دیکھو مجھے بھی بھول گئی ہے۔''

گھر پہنچ کر ماں نے کہا کہ اسے اپنے بھائی کے یہاں جانا ہے اور ضد کی کہ وہ اکیلی جائیں گی۔ بھلا میں انہیں اکیلی کیسے جانے دیتا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر نکل گئیں۔ اسے

بند کر کے میں ان کے پیچھے جانے لگا۔ وہ ایک بس اسٹاپ پر رکیں اور پہلی ہی بس میں سوار ہوگئیں۔ ٹکٹ بھی نہیں خریدی۔ میں بھی بس میں سوار ہوگیا اور بس ڈرائیور سے دو ٹکٹیں لیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کا بھائی کہاں رہتا ہے اسی لئے میں چوکنا بیٹھا رہا تاکہ جونہی ماں اترے گی میں بھی ان کے پیچھے اتر جاؤں گا۔ بس اپنی آخری اسٹاپ پر رکی۔ ڈرائیور نے ہم دونوں سے پوچھا کہ ''کہاں جانا ہے؟'' ماں نے جواب دیا''پتہ نہیں!'' پھر میں نے ڈرائیور کو سمجھایا۔

ماں کی خیریت معلوم کرنے کے لئے ژاں مجھے ہر رات فون کرتا تھا تاکہ میں اسے بتا سکوں کہ دن میں کیا ہوا ہے۔ اپنے بھائی کے یہاں جانے والا واقعہ میں نے اسے سنایا۔

''میرے دوست میں تمہارا احسان مند ہوں۔ جب تک تم وہاں ہو مجھے اطمینان ہے مگر تمہارے جانے کے بعد مجھے پتہ نہیں کہ میں کیا کروں گا۔ ماں کا بھائی تو دس سال پہلے اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکا ہے۔ ماں یہ بھول گئی ہیں۔'' ژاں نے کہا۔

اگلے ویک اینڈ پر ژاں جب آیا تو ماں اسے پکڑ کر رونے لگیں اور کہا: ''مجھے تمہارا نام یاد نہیں آرہا ہے۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں سب کچھ بھولتی چلی جا رہی ہوں۔ تمہارا دوست بہت اچھا آدمی ہے۔ مجھے چاروں طرف سیر کرانے لے جاتا ہے۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ بیٹا مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلو تاکہ وہ مجھے کوئی دوا دے کہ میں نہیں بھولوں۔''

''ماما آپ کو ڈاکٹر نے دوائیں دی ہیں۔'' ژاں نے کہا۔

''نہیں تو۔تم مجھے ڈاکٹر کے پاس کب لے گئے تھے۔'' ماں نے کہا۔

''ماما آپ فکر نہ کریں۔ میں ڈاکٹر کو فون کر کے وقت لیتا ہوں۔'' ژاں نے کہا۔

ژاں بہت افسردہ اور مایوس ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کی ماں بڑی تیزی سے اس منزل تک پہنچ رہی ہیں جہاں اس کی یادداشت بالکل ختم ہو جائے گی اور وہ کسی کو نہیں پہچان سکیں گی۔ ژاں کو اسی بات کا ڈر تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں اس مرحلہ تک پہنچے۔ اس نے ڈاکٹروں سے ایلزائمر کے بارے میں پوچھا تھا اور پڑھا بھی تھا مگر اسے پتہ نہیں تھا کہ یہ بیماری اتنی تیزی سے بڑھے گی۔ ایسی صورتِ حال میں وہ چاہتا تھا کہ وہ ملازمت چھوڑ کر ماں ہی کے پاس رہے۔ بلکہ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ اس کا بھائی اور اس کی بہن آجائیں اور ماں کے پاس رہیں تاکہ ماں کو وہ خوشی ملے جو ہر ماں کو اپنے تمام بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر ہوتی ہے۔

ژاں نے بھائی اور بہن کو فون کیا مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ پھر اس نے ایس ایم ایس کیا۔ رات کو دونوں نے ژاں کو فون کیا۔ دونوں نے بتایا کہ وہ اس ویک اینڈ میں نہیں ائیں گے کیونکہ اگلے ویک اینڈ میں ان کو 'فیت دے میغ' (Mother's Day) کے لئے آنا ہی ہے۔ ژاں نے دونوں کو پھر سے بتایا کہ ماں کی یادداشت کتنی تیزی سے جا رہی ہے۔

میری چھٹیاں ایک ہفتے کے بعد ختم ہونے والی تھیں۔ میں

آخری ہفتہ انگلینڈ میں گزارنا چاہتا تھا۔ پیر کی صبح میں ژاں کے ساتھ جانے والا تھا مگر ماں کی حالت دیکھ کر میں نے ژاں کو بتایا کہ میں ایک اور ہفتہ کے لئے ماں کے پاس رہ سکتا ہوں۔ ماں کو تنہا چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

"میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ تم وہ کر رہے ہو جو میرے سگے کو کرنا چاہیے تھا۔" ژاں نے کہا۔

"میں بھی تمہاری ماں کو اپنی ماں کی طرح سمجھتا ہوں۔ بس بات ختم۔لیکن تمہارا مسئلہ تو اپنی جگہ ہے۔ میرے بعد ماں کے پاس کون رہے گا۔ تم ایسا کرو کہ ماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ اور ایک رپورٹ مانگ لو جس میں وہ لکھے کہ ماں کی حالت کیسی ہے اور یہ بھی کہ ان کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس رپورٹ کو تم اپنے دفتر بھیج دو تاکہ تمہارا تبادلہ جلد از جلد ہو جائے۔" میں نے کہا۔

ڈاکٹر نے رپورٹ دے دی اور ژاں نے اپنے ایک دوست کو یہ ذمہ داری دے دی کہ اسے کالے کے دفتر میں پہنچا دے۔ دوست اسی دفتر میں کام کرتا ہے۔ دوست نے بتایا کہ اس کے تبادلہ کا چرچا ہے اور ایک افسر لندن جانے کو تیار ہوگیا ہے۔ شام کو وہ دوست اور وہ افسر جو لندن جانے کو تیار تھا ژاں سے ملنے آئے۔ ژاں نے ان سے میرا تعارف کیا اور یہ طے ہوا کہ میں اس افسر کے ہمراہ لندن جاؤں گا، اس کو فلیٹ میں لے جاؤں گا اور پہلے دن اسے اس کے دفتر میں چھوڑ کر آؤں گا۔

یہ آخری ہفتہ میرے لئے مشکل تھا۔ ماں کو خوش رکھنے

کے لئے مجھے مختلف ترکیبیں ڈھونڈنی پڑیں۔ باغ میں لے گیا، چڑیا گھر دکھایا، بازار لے گیا اور اسی طرح ان کو کئی اور جگہوں کی سیر کروائی۔ جمعرات کو ماں نے ضد کی کہ وہ کھانا پکائیں گی۔ وہ کچن میں تھیں اور میں ڈرائنگ روم سے ان پر ایک نظر رکھ رہا تھا۔ فرائنگ پین کو گیس اسٹو پر رکھا، آگ جلائی اور دو انڈے توڑ کر اس میں ڈالے۔ میں صرف اخبار لینے کے لئے اٹھا کہ جلنے کی بو آنے لگی۔ ماں وہیں کھڑی تھیں۔ ان کے سامنے فرائنگ پین میں انڈے جل رہے تھے۔ دھواں بھی اٹھنے لگا تھا۔ میں نے جلدی سے اسٹو بند کیا اور ماں کو ڈرائنگ روم میں لایا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ پڑوسن تھی۔ اس نے بتایا کہ کئی بار ایسا ہوا ہے۔ اسے جونہی کسی چیز کے جلنے کی بو آتی ہے تو وہ فوراً آجاتی ہے۔ ''بیچاری پر ترس آتا ہے۔ کتنی اچھی ہے۔ ہم دونوں اچھے دوست تھے۔'' پڑوسن نے کہا۔

جب ژاں کا فون آیا تو میں نے اسے نہیں بتایا کہ کچن میں کیا ہوا لیکن اگلے روز جب وہ واپس آیا تو مجھے بتانا پڑا۔ اسے حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔

''لیکن یہ تو بڑا خطرناک ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہے۔ اب مجھے ایک لڑکی یا عورت کو ڈھونڈنا ہے جو ماں کے ساتھ کم سے کم دن میں رہے گی اور رات کو میں رہوں گا۔ ہاں اگلے پیر سے میں کالے ہی میں کام کروں گا۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر تم اکثر ہم سے ملنے آؤ گے۔'' ژاں نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ ہماری دوستی برابر قائم رہے گی اور میں ماں کو دیکھنے آتا رہوں گا۔" میں نے کہا۔

اتوار کو ژاکلین اور اس کا بھائی ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ لئے ماں سے ملنے آئے۔ جب ماں کے ہاتھ میں گلدستہ دیا اور کہا: "بون فیت ماما" تو ماں نے ہر ایک کو پیار کیا اور بیٹے سے لپٹ کر رونے لگیں اور کہا: "میں تمہارا نام بھول گئی ہوں۔ دیکھو میں سب کچھ بھولتی جا رہی ہوں۔"

عموماً ایسے موقع پر ماں بچوں کے لئے خاص کھانا بناتی ہے مگر اس بار ژاں نے باہر سے کھانا منگوایا تھا۔ مجھے بھائی بہن سے ملوایا بھی اور بتایا کہ پیر کو میں لندن واپس جا رہا ہوں۔

"اب ماما کے پاس کون رہے گا۔" الفریڈ نے پوچھا۔

"کسی کو ڈھونڈنا ہوگا جو ماں کے پاس رہے۔" ژاں نے کہا۔

یہ سن کر دونوں چپ ہوگئے۔ ژاں کو اندازہ ہوگیا کہ معاملہ کیا ہے۔

'فیت دے میغ' کے دن بچے عام طور سے دیر تک گھر میں رہتے تھے مگر اس بار الفریڈ کھانا کھانے کے بعد ہی چلا گیا اور ژاکلین تھوڑی دیر کے لئے رکی صرف ماں سے یہ پوچھنے کے لئے کہ ان کے زیورات کہاں ہیں۔

"ژاکلین فکر مت کرو، ایک محفوظ جگہ پر ہیں۔" ژاں نے کہا۔

بچوں کا رویہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ پر کیا کریں۔ مجھے

ژاں پر ترس آرہا تھا۔ ماں کی ساری ذمہ داری بھائی اور بہن نے اسی پر چھوڑ دی ہے۔

میں لندن سے ہر دوسرے تیسرے دن ژاں کو فون کرتا تھا اور ماں کی خیریت معلوم کرتا ۔ ایک عورت مل گئی تھی جو ماں کے پاس رہنے کو تیار ہوگئی تھی۔ وہ اسی وقت گھر واپس جاتی تھی جب ژاں اپنے کام سے واپس آجاتا تھا۔ ایک بار پھر ماں ضد کر کے کچن میں پکانے گئی۔ گوشت کے دو ٹکڑے فرائنگ پین میں تل رہی تھیں۔ گوشت کے جلنے کی بوآنے لگی تو پڑوسن دوڑی آئی۔ ماں گھر پر اکیلی تھیں کیونکہ انہوں نے اس عورت کو کچھ سامان لانے بھیج دیا تھا۔ پڑوسن نے جلدی جلدی اسٹو بند کیا اور فرائنگ پین کو سِنک میں ڈال کر نل کھول دیا۔ ماں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہی تھی کہ ماں کی دیکھ بھال کرنے والی عورت آگئی۔ ژاں شام کو واپس آیا تو عورت نے اسے بتایا کہ ماں کی ضد پر اسے دکان جانا پڑا تھا اور ماں کچن میں پکانے گئی تھیں۔ پڑوسن نے آکر بچایا۔

ژاں نے پڑوسن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اس کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔

پڑوسن نے ژاں کو بتایا کہ کیا ہوا تھا اور کہا: ” بیٹا اب ماں کے لئے سوچنا ہوگا۔ اب ان کا اکیلی رہنا خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ تمہیں کچھ سوچنا چاہیے۔ “

” آپ کیا مشورہ دیں گی؟ “ژاں نے پوچھا۔

” میں سوچتی ہوں کہ اسے اولڈ ہوم یا maison de

retraite میں رکھ دینا چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے لئے بہت مشکل ہے مگر اس کے لئے بہتر ہے۔'' پڑوسن نے کہا۔

ژاں نے ماں کو اولڈ ہوم میں رکھنے کا کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔

تین چار روز بعد ژاکلین نے ژاں کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ دن میں اس نے ماں کو فون کیا تھا اور ماں نے بتایا کہ وہ اسے نہیں جانتی ہیں۔ ژاکلین نے پھر پوچھا کہ ماں کے زیورات کہاں ہیں اور کہا کہ بہتر ہے کہ ماں کو ایک ایسے ہوم میں رکھ دیں جو ایلزائمر والوں کے لئے ہے۔ اسی رات کو بھائی نے بھی فون کیا اور بتایا کہ اس نے ایک خاص ہوم سے رابطہ کیا اور وہ ماں کو وہاں رکھنے کے لئے تیار ہے۔ ژاں نے بھائی بہن اور پڑوسن کے مشوروں پر غور کیا مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ ماں کو اپنے گھر سے نکال کر کسی ہوم میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

ژاں تھکا ماندہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ گھبرا کر اٹھا اور دروازہ کھولا۔ ماں کو راستے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ژاں ان کے پیچھے جانے لگا۔ سامنے سے پڑوسن آرہی تھی۔ اس نے ماں کو اپنے ساتھ لیا اور دونوں گھر واپس آگئیں۔

''بیٹا اگر کوئی پولیس سے شکایت کر دے کہ تم ماں کی دیکھ بھال ٹھیک سے نہیں کر رہے ہو یا کوئی پولیس کو یہ بتادے کہ ماں کی وجہ سے فلیٹ میں آگ لگ جانے کا خطرہ ہے تو تمہیں پریشانی ہوجائے گی۔اسی لئے بہتر ہے کہ اب تم ماں کو کسی 'ہوم'

میں داخل کرادو۔ مجھے بہت افسوس ہوگا کہ تمہاری ماں میرے پڑوس میں نہیں رہے گی۔ ہم شروع سے ایک ساتھ رہے۔ برے اور اچھے دن دیکھے ہیں اور اب اس کی بھلائی ہی کے لئے میں خود تمہیں اسے ہوم میں رکھنے کا مشورہ دے رہی ہوں" پڑوسن نے کہا اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری ماں کے ساتھ کوئی حادثہ ہو۔ لیکن میں کیسے ماں کو اپنے ہی گھر سے نکال کر لے جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا ہے۔" ژاں نے بھر آئی ہوئی آواز میں کہا جو اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی۔

"بیٹا یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے وہاں لے جاؤں گی۔ بس تم کاغذات کی کاروائی پوری کر دو۔" پڑوسن نے کہا۔

دو روز بعد ہوم کا انتظام ہوگیا۔ ہر مہینہ ہوم کو پیسہ دینا ہوگا۔ ماں کو سرکار کی طرف سے ایک پنشن ملے گی باقی ژاں ہی کو دینا پڑے گا۔ کاغذات پر دستخط کرتے وقت ژاں اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا حالانکہ اسے تسلی دی جارہی تھی کہ ماں کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ وہ دفتر ہی میں تھا کہ پڑوسن ماں کو لے کر آگئی۔ ژاں فوراً وہاں سے نکل پڑا۔

رات ژاں نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ اس نے آج ماں کو ہوم میں داخل کرا دیا ہے اور یہ بھی کہا کہ ماں اسے بھی نہیں پہچان رہی ہیں۔ وہ آگے کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ میں نے کئی بار ژاں ژاں کہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے کہا: "معاف کرنا۔"

اسی جمعہ کی رات کو میں کالے پہنچا۔ اگلے روز صبح ہی ہم

دونوں ماں سے ملنے ہوم میں گئے۔ ایک خاتون ماں سے بات چیت کر رہی تھی۔ ماں اس کی باتیں بہت دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

اس خاتون نے ہمیں دیکھا اور آنے کا اشارہ کیا اور ماں سے پوچھا ''آپ انہیں جانتی ہیں؟''

''نہیں تم دونوں کون ہو؟'' ماں نے کہا۔

ہم دونوں نے ان کو بہت بتایا کہ ہم کون ہیں لیکن ان کو یاد نہیں آرہا تھا۔ خیر ان سے کافی دیر تک بات چیت کرتے رہے۔ چلتے وقت ہماری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ماں نے ہمیں دیکھ کر کہا: ''کیوں رو رہے ہو؟ مجھے لگ رہا ہے تمہیں اپنی ماں یاد آرہی ہے۔''

مگر آج وہ نہیں روئیں۔

ہم کچھ کہے بغیر وہاں سے نکلے۔ راستے بھر کسی نے بات نہیں کی۔

گھر پہنچے تو ژاں نے کہا: '' اب وہاں جانے سے کیا فائدہ۔ ماں کے لئے تو اب ہم کچھ نہیں ہیں۔ ''

'' لیکن تمہارے لئے ماں کچھ ہے یا نہیں؟ '' میں نے پوچھا۔

اگلے روز صبح ہی ژاں نے کہا: ''چلو ماں سے ملنے چلتے ہیں۔ ''

'' اس وقت تم میرے خاطر جا رہے ہو؟ '' میں نے پوچھا۔

'' نہیں میں اپنے لئے بھی جا رہا ہوں اور جاتا رہوں گا چاہے وہ مجھے پہچانے یا نہیں۔''

□□□

مدرسہ

''بیٹا میرے بزرگوں کی وصیت ہے کہ ہم اس مدرسے کو قائم رکھیں''۔ غلام محمد نے اپنے بیٹے ظفر کو سمجھایا۔باپ کی باتیں سنے بغیر ظفر کمرے سے نکل گیا۔

غلام محمد نے بچپن میں اسی مدرسے میں دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ساٹھ سال پہلے کا وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر آگیا جب وہ اپنی بہن کا ہاتھ پکڑے مدرسہ میں جا کر دوسرے بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا اور استاد نے کہا تھا: ''غلام محمد اب تم ہر روز ان بچوں کے پاس آکر بیٹھنا اور جو کچھ وہ سیکھ رہے ہیں تم بھی سیکھنا''۔

مدرسہ اور اس کے گھر میں صرف دس پندرہ گز کا فاصلہ تھا۔کچی دیواروں پر گنے کے سوکھے پتوں کی چھت والے مکان کے برابر ہی میں یہ مدرسہ تھا جس میں زیادہ سے زیادہ تیس لڑکے اور لڑکیاں ہر شام کو پڑھنے آتے تھے۔ برابر والے مکان کی طرح اس کی چھت بھی گنے کے سوکھے پتوں کی تھی لیکن اس میں صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی تھی جس سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ عمارت کتنی چھوٹی تھی۔ بیٹھنے کے لئے بینچ یا کرسی نہیں بلکہ مٹی

کے فرش پر میلی اور پھٹی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بچے چار گروپوں میں بیٹھتے تھے یعنی اس مدرسے میں چار جماعتیں تھیں لیکن استاد صرف ایک تھا۔ جس کے ہاتھ میں ہر وقت ایک چھڑی ہوتی تھی۔

اس مدرسے کی بنیاد کب پڑی تھی؟ غلام محمد کو صرف یہ یاد ہے کہ اس کے دادا عبدالکریم بتاتے تھے کہ جب اس علاقے کے مالک نے اپنی زمین کو ٹکڑوں میں کرکے بیچنا شروع کیا تو ان کے والد بقریدن نے دو بیگھے زمین خریدی۔ ان کے ساتھ ان کے کئی دوستوں نے بھی زمین خریدی۔ دادا کے والد بقریدن ہندوستان سے مزدوری کرنے کے لئے آئے تھے۔ وہ بہت پڑھے لکھے نہیں تھے۔ صرف تھوڑا بہت قرآن شریف اور اردو پڑھ سکتے تھے۔ کھیت میں مزدوری کرنے کے بعد انہوں نے آس پاس کے بچوں کو اپنے گھر ہی میں پڑھانا شروع کیا اور جب بچوں کی تعداد بڑھتی گئی تو انہوں نے اپنی ہی زمین پر ایک چھوٹا سا مدرسہ بنایا جہاں وہ بچوں کو دینیات اور قرآن شریف پڑھنا سکھانے لگے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا ان کی کوشش ہوتی تھی کہ بچوں کو کلمہ پڑھنا اور نماز ادا کرنا آجائے۔ غلام محمد اکثر کہتا تھا کہ ایسے لوگ نہ ہوتے تو پتہ نہیں آج اس جزیرے میں دین قائم رہتا یا نہیں۔ بقریدن نے اپنے بیٹے عبدالکریم کو وصیت کی کہ مدرسہ جاری رہے اور پڑھانے کی ذمہ داری ان کو سونپ دی۔ دادا کو جتنا آتا تھا وہی پڑھاتے تھے۔ دادا کی مالی حیثیت بہتر ہونے لگی تھی۔ زمین خرید لی تھی اور اپنی کھیتی باڑی کرنے لگے تھے۔ جب ایک دوسری

بستی سے ایک عمر رسیدہ مسلمان رمضانی چاچا دادا کی بستی میں آئے تو دادا کو پتہ چلا تھا کہ وہ ان سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ دادا نے رمضانی چاچا کو مدرسے میں بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری دے دی اور ان کو تنخواہ بھی دینے لگے۔رمضانی چاچا نے مدرسے میں بچوں کے ساتھ عصر کی نماز پڑھنا شروع کی۔ مغرب سے پہلے بچوں کو گھر واپس بھیج دیتے لیکن مغرب کی نماز مدرسے ہی میں پڑھتے تھے۔اب دادا کی یہ کوشش تھی کہ وہ مغرب سے پہلے کھیت سے گھر واپس آجائیں تاکہ وہ رمضانی چاچا کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھ سکیں۔ چند مسلمان دوستوں نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی آکر نماز پڑھیں گے۔جن جن کو نماز پڑھنا نہیں آتا تھا ان سب کورمضانی چاچا نے نماز پڑھنا سکھایا۔

دادا نے غلام محمد کے والد عبدالرحمان سے کہا اور اس بات پر زور ڈالا کہ وہ مدرسہ جاری رکھے اور رمضانی چاچا کی تنخواہ برقرار رکھے۔بستی میں پردادا کے زمانے کے بچے اب جوان ہوگئے تھے اور ان کے بچے بھی ہو گئے تھے۔ اسی طرح بستی میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ان نوجوانوں میں چند ایسے تھے جو رمضانی چاچا کی نگرانی میں پڑھتے رہے اور وہ اس لائق ہو گئے کہ وہ مدرسے کے کام میں رمضانی چاچا کی مدد کرنے لگے۔

مدرسے میں عصر اور مغرب کی نماز باجماعت جاری رہی۔ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ہر مہینہ بستی کے مسلمان مرد ایک بار مدرسے میں جمع ہوتے تھے۔مختلف مسائل پر صلاح مشورہ کرتے تھے۔کبھی قرآن خوانی ہوتی تھی تو کبھی میلاد۔ محرم کے دس دنوں

میں رمضانی چاچا واقعات کربلا بیان کرتے اور ان کے شاگرد ''عناصر شہادتین'' پڑھ کر سناتے۔ربیع الاوّل کے مہینے میں میلاد کے ساتھ رسول کریم ﷺ کی زندگی اور اسوہ حسنہ پر بیان ہوتا۔ربیع الآخر کے مہینے میں حضرت عبدالقادر جیلانی کی زندگی اور تعلیمات پر بیانات ہوتے تھے۔ایسی محفلوں کی بدولت جوان اور بوڑھے مردوں کی تعلیم ہوتی اور ان میں اتحاد اور اتفاق قائم رہتا۔

ہر مہینے وہ اسی طرح ملتے رہے۔ ایک بار ایسی ہی ملاقات کے دوران غلام محمد کے ابا عبدالرحمان نے تجویز پیش کی کہ بستی میں ایک مسجد ہونی چاہیے۔اس کے لئے بستی کے لوگوں سے چندہ کیا جائے تاکہ اس پیسے سے ایک ٹکڑا زمین خریدی جائے جس پر مسجد کی تعمیر ہو۔

'' میں اس مدرسے کو مسجد میں تبدیل کرنا نہیں چاہتا ہوں۔میری خواہش ہے کہ بستی کا ہر مسلمان زمین خریدنے اور مسجد بنانے میں حصہ لے۔ہم ایک جماعت بناتے ہیں ۔جو جتنا چاہے دے سکتا ہے ۔ اسی جماعت کے نام سے زمین خریدی جائے گی اور مسجد بنائی جائے گی۔'' غلام محمد کے والد نے کہا۔

'' تو اس مدرسے کا کیا ہو گا؟'' رمضانی چاچا نے پوچھا۔

'' چاچا یہ برابر جاری رہے گا۔آپ ہی اسے سنبھالیں گے۔ میری خواہش ہے کہ مسجد کے امام آپ ہی ہوں''۔عبدالرحمان نے کہا۔

جماعت کے سبھی لوگوں نے چاہا کہ رمضانی چاچا ہی مسجد کے امام ہوں۔

بستی کے تمام مسلمان اس جماعت میں شامل تھے۔ عبدالرحمان نے رمضانی چاچا کی مدد سے ان سب کے نام لکھے۔ ہر شخص جتنا پیسہ دیتا اس کے نام کے آگے وہ رقم لکھ دی جاتی۔ اس جماعت کے سردار غلام محمد کے والد ہی کو بنایا گیا۔ جماعت کے نام سے زمین خریدنے کے لئے ضروری تھا کہ جماعت سرکار میں رجسٹرڈ ہو۔ اس کا بندوبست کر لیا گیا۔ مدرسے کے قریب ہی ایک بیگھا زمین تھی۔ ایک سال کے اندر زمین خرید لی گئی۔ سب نے مل کر مسجد بنائی۔ اب وہیں پر پانچ وقت اور جمعہ کی نماز بھی ہونے لگی۔ رمضانی چاچا اپنے نوجوان شاگردوں کے ساتھ مدرسے میں برابر پڑھاتے رہے۔ عبدالرحمان، غلام محمد سے اکثر کہتے تھے: " بیٹا مدرسے کو جاری رکھنا۔" غلام محمد نے اپنے والد کی یہ وصیت مان لی۔

والد کے انتقال کے بعد بستی والوں نے غلام محمد کو جماعت کے سردار کا عہدہ سنبھالنے کو کہا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بہتر ہے کہ جو عمر میں اور تجربہ میں اس سے بہتر ہو ان کو سردار بنایا جائے۔ اس نے خود ایک بزرگ کا نام تجویز کیا۔ سب ہی لوگوں نے اس شرط پر منظوری دے دی کہ مدرسہ خود غلام محمد سنبھالے۔ وہ اس کے لئے راضی ہو گیا۔

وقت گذرتا گیا۔ بستی میں تیزی سے ترقی ہونے لگی۔ مدرسے کے سامنے کچی سڑک تھی جو اب پکی اور چوڑی ہوگئی ہے۔ بیل گاڑیوں کی جگہ اب ٹرک نے لے لی۔ پورٹ لوئس جانے کے لئے بسیں چلنے لگیں۔ بستی میں چار پانچ لوگوں کے پاس اپنی اپنی

کار ہوگئی۔اب بچے کالج بھی جانے لگے۔غلام محمد کھیتی باڑی چھوڑکر تجارت کرنے لگا۔اس نے مدرسے کی پرانی عمارت کی جگہ پر ایک نئی اور بڑی عمارت بنوائی جس کے برابر میں چھوٹا سا گودام بنایا جہاں دیگیں، دیگچیاں، پلیٹین ،گلاس اور دوسراسامان رکھا جاتا تھا۔یہ سامان بستی والوں کے لئے تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ اسے استعمال کرنے کے لئے لے جاتے ہیں۔جماعت کے چند اصول بھی بنائے گئے جیسے مسجد کے اخراجات کے لیے ایک مقررہ رقم دینا، میت میں شریک ہونا، شادی بیاہ کے موقعوں پر حاضر ہونا اور مدد کرنا،اگر کوئی غلط کام کر رہا ہو تو اسے روکنا، ایک دوسرے کی مدد کرنا وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

غلام محمد اپنی دکان میں بیٹھا ان پرانی یادوں میں کھویا ہوا تھا کہ ظفر ہاتھ میں ایک لفافہ لئے اس کے پاس آیا۔

’’پاپا، میں نے آپ کے پردادا کے زمانے کے اس زمین کے تمام کاغذات منگوا لئے ہیں۔ان میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ زمین پر ایک مدرسہ ہے اور نہ کوئی وصیت نامہ نظر آیا ہے۔آپ وصیت وصیت کرتے رہتے ہیں۔ٹھیک ہے کسی زمانے میں مدرسے کی ضرورت تھی جہاں الٹی سیدھی چیزیں پڑھائی جاتی تھیں۔۔۔۔‘‘ظفر بولے جا رہا تھا کہ اس کے والد نے اسے روکا اور کہا: ’’بیٹا بس کرو تمہیں شرم آنی چاہئے۔ یہ مدرسہ ہمارے بزرگوں کی امانت ہے اور ان کے لئے باعث ثواب جاریہ ہے۔ اس سے ہمارے بزرگوں کی روحوں کو سکون ملتا ہو گا۔ نہیں میں مدرسے کے بارے میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا ہوں۔میری بھی وصیت ہے کہ تم اس مدرسے

کی دیکھ بھال کرنا اور اسے ہمیشہ جاری رکھنا۔" غلام محمد نے کہا۔

ظفر نے پڑھائی پوری نہیں کی تھی کیونکہ کالج جانے کے بجائے وہ دوستوں کے ساتھ دن بھر آوارہ گردی کرتا تھا۔بیوی کے اچانک انتقال کے بعد غلام محمد نے ظفر کو اپنے ساتھ کام میں لے لیا۔جلد ہی وہ باپ کے کام کو چھوڑکر ایک کپڑے کے کارخانے میں ملازم ہو گیا۔غلام محمد ظفر کی اس حرکت سے مایوس تو ہوا مگر سوچا کہ وہاں کام کرنے سے اسے ایسی تربیت ملے گی جو اس کی زندگی میں تبدیلی لا سکتی ہے۔پھر یہ بھی تھا کہ باہر کے سرمایہ دار مقامی پارٹنرز کے ساتھ کارخانے کھولنے لگے ہیں۔سرکار بھی ایسے کارخانوں کو سہولتیں دے رہی ہے۔ظفر کو کپڑے کے کارخانے کا تجربہ ہو جائے گا تو کسی باہر کے سرمایہ دار سے مل کر ایک کارخانہ کھول سکتا ہے اور پھر آرام سے اپنی زندگی گذار سکے گا۔ وہ ظفر کو مالی مدد دینے کے لئے تیار تھا۔

آخرکار یہی ہوا۔ ظفر کو ہانگ کانگ (Hong Kong) کا ایک سرمایہ دار ملا جو اسے اپنا مقامی پارٹنر بناکر کپڑے کا ایک کارخانہ کھولنے کو تیار ہو گیا۔ شرط یہ تھی کہ ظفر زمین مہیا کرے۔

اپنے والد کو بتائے بغیر ظفر نے مدرسے والی زمین سرمایہ دار کو دکھادی۔

"اس میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دو تین جگہوں پر زمینیں ہیں۔تم بتاؤ کون سی زمین چاہیے۔ میں اسے تمہارے نام کر دوں گا۔" غلام محمد نے کہا۔

'' ابا تو میں کاروائی شروع کر دوں''۔ ظفر نے کہا۔

'' بیٹا اچھی طرح سے دیکھ بھال کر اور پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد قدم اٹھانا۔'' غلام محمد نے کہا۔

اگلے روز کارخانہ جانے کے بجائے وہ ایک نوٹری (notary) کے دفتر میں گیا۔اس کے پاس مدرسے والی زمین کے کاغذات تو تھے ہی۔نوٹری کے کلرک نے بتایا کہ غلام محمد کی رضامندی چاہئے اور ان کو آکر دستخط کرنے ہونگے۔

'' میرے والد تیار ہیں۔تم صرف بتا دو کب آنا ہو گا۔'' ظفر نے کہا۔

'' اگلے جمعرات کو دوپہر دو بجے آجائیے۔'' کلرک نے کہا۔

گھر آ کر ظفر نے اپنے والد سے کہا: '' ابا، ہمیں کارخانے میں کام کرنے کے لیے پانچ سو لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔بستی والوں کو اور خاص کر مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔آپ دیکھئے ہماری بستی کا نقشہ چند برسوں میں بدل جائے گا''۔ ظفر نے کہا۔

'' خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' غلام محمد نے کہا۔

جمعرات کو باپ بیٹے نوٹری کے پاس پہنچے۔ نوٹری میں ظفر کے نام ہونے والی زمین کے بارے جب پڑھ کر سنایا گیا تب غلام محمد کو پتہ چلا کہ یہ زمین تو مدرسہ والی زمین ہے۔ اسے بہت غصہ آیا اور اس نے بلند آواز میں کہا: ''نہیں،نہیں۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا''اور زمین پر گر پڑا اور منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ فوراً

امبولنس بلائی گئی اور اسے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔دو روز بعد غلام محمد اس دنیا سے چل بسے۔

بستی کے تمام ہندو اور مسلمان غلام محمد کے جنازے میں شریک ہوئے۔تدفین کی ساری ذمہ داری جماعت کے سردار نے لی تھی۔ دفنانے کے بعد اس نے ظفر سے کہا: ''بیٹا ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے والد نہ صرف میرے اچھے دوست تھے بلکہ ساری بستی والوں کے خیرخواہ تھے۔ تم اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھو۔ اب تمہیں ہی مدرسہ سنبھالنا ہو گا۔ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے!۔''

ظفر نے دیکھا کس طرح گودام میں رکھی ہوئی ساری چیزیں استعمال ہوئیں۔ اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ دونوں باپ بیٹے نوٹری کے پاس گئے تھے۔ چالیس دنوں تک اس کے گھر میں قرآن خوانی ہوتی رہی۔ پھر 'چالیسویں' کے لئے گودام سے دیگیں نکالی گئیں۔بریانی پکائی گئی ۔بستی کے مسلمانوں کی دعوت تھی۔ انہیں لوگوں نے برتنوں اور دوسری چیزوں کو صاف کرکے گودام میں واپس رکھ دیا۔ ظفر کو کچھ نہیں کرنا پڑا۔

''اچھا بیٹا، ہم سے جو کچھ ہو سکا ہم نے کیا۔خدا مرحوم کو جنت عطا کرے۔اب میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم ایک اچھی لڑکی ڈھونڈ کر تمہاری شادی کروا دیں۔تم اس طرح اکیلے نہیں رہ سکتے۔''جماعت کے سردار نے کہا۔

'' ہم اس پر بعد میں بات کریں گے۔ابھی تو آپ مجھے بتا دیجئے کھانا وغیرہ کے اخراجات کتنے ہوئے۔میں ابھی آیا۔'' ظفر نے

کہا اور گھر میں چلا گیا اور پھر پانچ ہزار روپے لے کر واپس آیا۔" چاچا، لیجیے اوراگر زیادہ خرچ ہوا ہو تو مجھے بتا دیجیے۔ میں اور لے آتا ہوں۔" ظفر نے کہا۔

"نہیں بیٹے، جو اخراجات ہوئے ہیں اس کی تفصیل میرے پاس ہے۔کل صبح تمہیں آ کر بتا دوں گا۔"سردار نے کہا۔

اگلے روز تقریباً نو بجے اخراجات کی تفصیل لے کر وہ ظفر کے پاس آئے۔سات سو پچھتر روپے دس سینٹ ظفر کے ہاتھ میں تھمایا۔ ظفر نے پیسے اپنی جیب میں رکھ لیے۔ سردار اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔کل سے مدرسے کی عمارت کو ڈھایا جائے گا۔اس کی جگہ ایک تین منزلہ عمارت بنائی جائے گی جس میں ایک کارخانہ لگایا جائے گا۔ گودام بھی توڑا جائے گا۔ فی الحال سارا سامان میرے گھرمیں رکھ دیں جب تک کہ آپ اسے کہیں رکھنے کا انتظام نہ کر لیں۔ہاں مدرسے کے بچوں کو سرکاری اسکول میں سنیچر اور اتوار کو پڑھانے کا انتظام کرادوں گا۔ مدرسے میں جتنی چیزیں ہیں گودام کے سامان ہی کے ساتھ رکھوا لیجیے۔ کارخانے میں سلائی کا کام ہو گا۔ہمیں خاص کر لڑکیوں اور عورتوں کی ضرورت ہوگی۔ بستی والوں کو آمدنی کا ایسا ذریعہ کبھی نہیں ملا ہے۔" ظفر نے کہا۔

سردار سکتے میں آ گیا۔ اسے اپنی کانوں پہ یقین نہیں ہورہا تھا۔چند لمحوں کے لئے وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔ پھر اس نے کہا:

"تمہارے والد نے کوئی وصیت نہیں کی تھی۔"

"ہاں کئی بار زبانی کی تھی مگر میرے پاس کوئی تحریری وصیت نہیں ہے۔" ظفر نے کہا۔

"واہ بیٹا واہ! تمہارے دادا نے شاید اسی لئے اس مدرسہ کو مسجد میں تبدیل نہیں کیا تھا۔ بہت دور اندیش تھے۔تم فکر مت کرو۔ سامان رکھنے کا انتظام ہم کر لیں گے۔ ہم ایک چیز بھی یہاں نہیں چھوڑیں گے۔ ہم ساری چیزیں اٹھا کر لے جائیں گے بس شام تک کی مہلت دے دو۔ یہ زمین اب تمہاری ہے، جو چاہو کرو۔" سردار نے کہا۔

جماعت کے ممبران کو آگاہ کرنا تھا مگر اس وقت اکثر کھیت میں مزدوری کے لئے گئے ہوئے تھے۔ سردار نے سب سے کہلوا بھیجا کہ ان کو آج ہی چار بجے مدرسے میں آنا بہت ضروری ہے۔

اس وقت بچے مدرسے میں آچکے تھے۔ایک ایک کرکے ممبران آنے لگے۔ جو کچھ ظفر نے کہا تھا سردار نے سب کو سنایا۔

"دیکھو، ظفر اس زمین کا مالک ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ہماری جماعت قائم رہے گی اور سب کچھ ویسے ہی ہو گا جیسے کہ اب تک ہوتا آیا ہے۔ سامان رکھنے کے لئے میرا گھر حاضر ہے۔رہی مدرسے کی بات تو اس کے لئے تو مسجد ہے ہی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔اس وقت ہم سب مل کر غلام محمد اور ان کے بزرگوں کے لئے دعا مانگیں۔ ان کی بدولت اس بستی میں اسلام قائم ہے ۔ یہ بھی دعا کریں کہ اللہ ظفر کو ہدایت دے۔" سردار نے کہا۔

مدرسے کے بچے اور جماعت کے ممبران نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ مدرسہ میں پڑھانے والے نوجوان نے بھی دعا مانگی۔ اکثر لوگوں کی آنکھیں نم تھیں۔اب سردار بھی مشکل سے کچھ کہہ پا رہا تھا، صرف یہ کہہ پایا: ''کہ خدانے اچھا کیا کہ غلام محمد کو اس سے پہلے ہی اٹھا لیا۔ وہ یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتا۔''

تقریباً ایک گھنٹے میں گودام کا سارا سامان سردار کے گھر کے برآمدے میں رکھ دیا گیا۔مدرسے کی چیزیں مسجد کے صحن کے ایک کونے میں رکھ دی گئیں۔

'' چاچا اب جماعت کے لئے ہم کہاں ملیں گے؟'' ایک نے سردار سے پوچھا۔

''مسجد کے صحن میں عشاء کی نماز کے بعد ملیں گے۔کم سے کم مسجد سے تو ہمیں کوئی نہیں نکال سکتا۔ بزرگوں کی کیا دور اندیشی ہوتی ہے۔''درد بھری آواز میں سردار نے کہا۔

'' گویا ان کو اندازہ تھا کہ ذاتی ملکیت کی وجہ سے ایک دن ایسا ہو سکتا تھا جو آج ہو رہاہے۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

اگلے روز ایک ٹرک میں بیس پچیس لوگ آئے۔ظفر سے ملے۔ تھوڑی دیر بعد ایک چینی بھی آیا۔ظفر سے مل کر باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے عمارت کے اندر جھانکا اور گودام میں جا کردیکھا۔ اس کے بعد دونوں نے کام کرنے والوں کو حکم دیا کہ عمارت کو ڈھایا جائے۔اب ظفر اپنی آنکھوں کے سامنے اس مدرسے کو نیست و نابود ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا جس کی بنیاد اس کے بزرگوں نے رکھی تھی اورجہاں کئی نسلوں کو دینی تعلیم دی گئی

تھی۔ اس کے چہرے سے نہ غم ظاہر ہو رہا تھا اور نہ ہی شرمندگی۔ وہ اپنے پارٹنر سے ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا۔جماعت کے سردار کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ آکر اس منظر کو دیکھے ۔صرف بچے اسکول جاتے وقت دیکھ رہے تھے کہ ان کے مدرسے کا کیا حشر ہو رہا ہے۔

پانچ مہینوں میں ایک لمبی چوڑی تین منزلہ عمارت تیار ہو گئی۔کپڑے سینے کی مشینیں اور نہ جانے کیا کیا چیزیں لگائی گئیں۔کارخانے میں کام شروع ہو گیا۔کام کرنے والے بستی کے باہر کے لوگ تھے جن میں زیادہ تر لڑکیاں اور عورتیں تھیں۔بستی کے صرف دو تین لڑکوں کو کام ملا تھا۔کارخانے کے سامنے کھانے پینے کی چیزیں بیچنے کی ایک دکان کھلی مگر اس کا کام زیادہ نہیں چلا کیونکہ کارخانے ہی میں ایک کینٹین کھل گیا تھا۔کینٹین چلانے والا پورٹ لوئس کا ایک چینی تھا۔

لڑکیاں اور عورتیں دوسرے گاؤں یا شہر سے آتی تھیں۔ان کو کارخانے میں ساڑھے سات بجے پہنچ جانا پڑ تھا۔یہاں سے پانچ بجے چھٹی ہوتی تھی۔ہانگ کانگ میں لوگوں سے مشین کی طرح کام کروایا جاتا ہے اور یہی طریقہ سرمایہ‌دار نے یہاں بھی اختیار کیا۔ پیسہ تو ملتا تھا مگر جتنا کام ان سے کروایا جاتا تھا اس کے عوض میں پیسہ کم تھا۔کارخانوں نے ایک نئے طرز زندگی کا آغاز کیا جہاں خواتین کو سویرے گھر چھوڑنا پڑتا تھا اور دیر سے گھر پہنچتی تھیں۔ بچوں پر ماں کی غیر حاضری کا اثر یقیناً پڑنے لگا۔اب شوہر نے بھی کھانا پکانا شروع کردیا۔ باہر سے کھانا خریدنے کا رواج اور

نوڈل یعنی مِن کھانا عام ہونے لگا۔ کارخانے کی تھکن ان کی صحت پر اثر کرنے لگی لیکن آمدنی کی وجہ سے ان کو کام کرنا ضروری ہو گیا۔ اسی آمدنی نے لڑکیوں اور عورتوں کو خود مختار بننے کے لئے اکسایا۔ لڑکے اور لڑکیاں ساتھ کام کرنے لگے جس کی وجہ سے ان کی رویوں میں تبدیلیاں آنے لگیں۔

اب زرعی معاشرہ صنعتی معاشرے میں تبدیل ہونے لگا۔ بستی کے لڑکے کھیت میں کام کرنے کے بجائے کارخانے میں کام کرنا پسند کرنے لگے۔وہاں وہ دھوپ اور بارش سے محفوظ رہتے اور لڑکیوں کے درمیان رہتے۔بستی کے ایک مسلمان لڑکے نے ایک عیسائی لڑکی سے کورٹ میریج کر لی۔ جماعت کے سردار اور دوسرے لوگوں نے لڑکے کو سمجھایا کہ وہ لڑکی سے نکاح بھی کر لے لیکن دونوں راضی نہیں ہوئے۔یہ اچھا ہوا کہ دونوں نے شہر میں کرائے کا ایک کمرہ لے لیا اور وہیں ایک ساتھ رہنے لگے۔جماعت میں یہ طے ہوا کہ ممبران کی کوئی اولاد کارخانے میں کام کرنے نہیں جائے گی۔اس فیصلے کا ظفر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ویسے بھی نہ وہ مسجد جاتا تھا اور نہ کسی سے رابطہ رکھتا تھا۔جس گھر میں وہ اپنے والد کے ساتھ رہتا تھا اسے کارخانے کا گودام بنا دیا اور خود شہر میں رہنے چلا گیا۔جماعت والوں کو نہیں معلوم تھا کہ ظفر کیسی زندگی گذار رہا ہے۔معلوم کرنے سے بھی کیا فائدہ ہوتا ! اب ظفر کے پاس ایک نئی اور خوبصورت گاڑی ہے۔کبھی سردار راستے میں نظر آجاتے تو ظفرنظریں پھیر لیتاہے۔

ہانگ گانگ کا سرمایہ دار اکثر باہر جانے لگا۔ایک دو بار

ظفر کو بھی بھیجا۔کاروبار اپنے عروج پر تھا۔ظفر اور اس کا پارٹنر بہت خوش تھے۔آمدنی اچھی ہونے لگی اور نفع بھی ہونے لگا۔دونوں نے طے کیا کہ مزید ترقی کے لئے نئی قسم کی مشینیں منگوائی جائے جن سے کام بہتر ہو اور پیداوار بڑھ جائے۔ بینک سے قرض کی درخواست کی ۔تحقیق کے بعد بینک نے قرض کی منظوری دے دی۔سرمایہ دار خود نئی مشینیں خریدنے کے لئے قرض کے پورے پیسے لے کر چین چلا گیا۔ ظفر کارخانہ سنبھالنے لگا۔ پہلے دو ہفتوں کے دوران ہر روز دونوں فون پر بات چیت کرتے تھے۔ اس کے بعد جب بھی ظفر فون کرتا کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایک بار اس کے پارٹنر کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ بیمار پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ سفرنہیں کر سکے گا۔ جونہی اس کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو وہ واپس آجائے گا۔

پانچ مہینوں تک ظفر کارخانہ اکیلا سنبھالتا رہا۔بینک والے نئی مشینوں کے بارے میں پوچھنے لگے اور قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرنے لگے۔ ظفر بنک گیا اور بتایا کہ اس کے پارٹنر کی کوئی خیرخبر نہیں۔ قرض کا پورا پیسہ لےکر چلا گیا تھا۔ جب ظفر نے کارخانے کے بینک آکاؤنٹ کے بارے میں تفتیش کی تو پتہ چلا کہ اس سے بھی ایک بہت بڑی رقم نکال لی گئی تھی۔اب کارخانے کے اکاؤنٹ میں بہت کم پیسے رہ گئے۔ظفر کو ایک بڑا جھٹکا لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کا پارٹنر اسے اتنا بڑا دھوکا دے گا۔

”اتنے پیسے میں آپ اپنے کام کرنے والوں کو تنخواہ کیسے دیں گے؟“ بینک کے منیجر نے پوچھا۔

ظفر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"اب آپ ہی میری مدد کریں۔" ظفر نے التجا کی۔

"دیکھیے، میں اپنی طرف سے صرف ایک مہینے کے لئے بندوبست کر سکتا ہوں۔اب آپ کو احتیاط کرنا ہے بلکہ میں یہ بھی مشورہ دوں گا کہ اپنے پارٹنر سے رابطہ کریں اور اس کارخانے کو بیچنے کے بارے میں سوچیں ورنہ آپ کا بہت نقصان ہو جائے گا۔" منیجر نے کہا۔ ظفر بینک سے بہت پریشان نکلا۔

جو آمدنی ہوتی تھی وہ قرض کی ادائیگی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ دو مہینوں کے بعد بینک نے کارخانے پر قبضہ کرلیا۔ ظفرکو کارخانے سے نکال دیا۔جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے کارخانے کی ہر ایک چیز واپس کرنی پڑی۔ اس کے پاس نام کے پیسے رہ گئے تھے۔اس نے سوچا کہ شہر چھوڑ کر اپنے مکان میں واپس آجائے۔ جب اس نے بینک والوں سے مانگ کی کہ اس کا مکان اسے واپس کر دیا جائے تو اسے بتایا گیا کہ جب کارخانہ بنانے کے لئے زمین دی گئی تھی تو اس میں سے گھر کو خارج نہیں کیا گیا تھا لہٰذا مکان پر ظفر کا کوئی حق نہیں۔

بستی والوں کو کارخانے کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔ جماعت کے ممبران میں چند یہ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ ظفر نے جو کچھ کیا تھا اس کی سزا بھگت رہا تھا مگر جماعت کے سردار کو اس سے ہمدردی تھی۔اس نے سوچا کہ یہ اچھا موقع ہے کہ اسے دین کی طرف لایا جائے۔کسی نے اسے بتایا کہ ظفر بستی میں آیا ہوا ہے۔وہ فوراً اسے ڈھونڈنے نکلا۔

"بیٹا، تم یہ مت سوچو کہ تم اکیلے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے ساتھ گھر چلو۔ہم وہیں بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔" سردار نے کہا۔

سردار کی باتیں سن کر ظفر سکتے میں آگیا۔سردار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا:"بیٹا چلو، تم فکر نہ کرو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔چلو۔" مگر ظفر کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔

"بیٹا، چلو میرے ساتھ چلو۔میں غلام محمد کا واسطہ دیتا ہوں۔چلو" سردار نے کہا۔

سردار اسے اپنا گھر لے گیا۔بیوی کو بلایا ۔

"بیٹا، تم اب ہمارے ساتھ ہی رہو۔میں تمہارے لئے پانی لاتی ہوں۔تم بیٹھو۔" سردار کی بیوی نے کہا۔

"چائے بھی لے آنا۔" سردار نے کہا۔

چائے پینے کے بعد سردار نے کہا:" ظفر اب تم بتاؤ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ تمہیں بالکل جھجکنا نہیں چاہیے ۔تم مجھے نہیں بتاؤ گے تو کس کو بتاؤ گے۔"

ظفر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ظفر نے کہا۔

"میرے پارٹنر نے ہیرا پھیری کی۔بینک سے تقریباً سارے پیسے لے کر بھاگ گیا۔اب اس کی کوئی خبر نہیں۔بینک والوں نے کارخانے پر قبضہ کر لیا ہے۔میں لٹ گیا۔اب نہ زمین رہی نہ مکان۔"

"تم کارخانہ بیچ کر بینک کا پیسہ چکا دو۔" سردار نے کہا۔

ظفر نے بتایا کہ قرض کا جتنا پیسہ ہے اس کو ادا کرنے کے لئے اگر کارخانہ بیچ بھی دیں تو قرض ادا نہ ہو گا۔

''کورٹ کچہری میں نہیں جا سکتے ؟''۔سردار نے پوچھا۔

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں بچا ہے۔والد صاحب نے بہت محنت کر کے اتنا کچھ میرے لئے چھوڑا اور میں نے سب گنوا دیا۔ اب کچھ باقی نہ رہا۔'' ظفر نے کہا اور زاروقطار رونے لگا۔

'' بیٹا تم پریشان مت ہو۔اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔اب سے تم ہمارے ساتھ ہی رہو۔'' سردار نے کہا۔

''مجھے میرے کئے کی سزا مل رہی ہے۔''ظفر نے بڑی مایوسی کے ساتھ کہا۔

ظفر کے لئے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔جاتا تو کہاں جاتا۔

اگلے روز دوپہر میں لکڑیاں اور گھر بنانے کا دوسرا سامان سردار کے پاس آگیا۔اتوار کے دن جماعت کے تمام کے ممبران اور ان کے ہندو اور عیسائی دوست سردار کے یہاں جمع ہوئے۔سردار نے اپنے گھر سے دس گز کے فاصلے پر اپنی زمین پر سب کو لے گئے۔

''ظفر کے لئے یہیں پر ہم دو کمروں کا کا ایک مکان بنا تے ہیں'' سردار نے کہا۔

ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے بعد کام شروع ہوگیا۔

ظفر کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ ان لوگوں کے سامنے جائے۔

□□□

نئی گاڑی

آج کی دنیا میں کس کو ایک نئی گاڑی کا شوق نہیں ہوتا!۔ خاص کر جب بزنس (business) ٹھیک سے چل رہا ہو اور بینک بیلینس (bank balance) میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہو۔

میرے دوست اظہار کو ہمیشہ سے نئی اور مضبوط گاڑیوں کا بے حد شوق تھا۔آج کل اس کے بزنس میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ایمانداری اور خدا کا خوف اپنے دل میں رکھتے ہوئے وہ اپنا کام کرتا ہے۔یہ تربیت اس نے اپنے والد سے پائی ہے۔والد کا اظہار کے بزنس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔وہ تو چھوٹے پیمانے پر کھیتی باڑی سے اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔آج بھی وہ اپنے کھیت میں جاتے ہیں جہاں ایک دو مزدور کام کرتے ہیں۔ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ان کی مدد کرتے ہیں اور پھر گھر واپس آجاتے ہیں۔روزانہ قریب کی مسجد میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔دینی کاموں میں مدد کرنے سے انہیں سکون ملتا ہے اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے بچے کوئی غیر اسلامی عمل نہ کریں۔ حالانکہ وہ اظہار کے بزنس میں دخل نہیں دیتے پھر بھی ہر وقت تاکید کرتے ہیں خدا اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کو اپنائے۔اظہار

کے والد کوئی عالم نہیں ہیں۔وہ بس اچھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر اور وعظ و نصیحت سن کر جو معلومات یا سبق حاصل کرتے ان پر حتی الامکان عمل کرتے اور اپنے بچوں کو بھی سکھاتے ہیں۔

اظہار کو نئی گاڑیوں کا شوق اس لئے نہیں ہے کہ انہیں خرید کر دوسروں کو دکھاتا پھرے۔ اسے نئی گاڑیاں خوبصورت اور اچھی لگتی ہیں۔ جب اس کے پاس پیسہ نہیں تھا وہ صرف نئی اور مضبوط گاڑیوں کو جی بھرکر دیکھتا تھا اور ان کی خصوصیات کے بارے میں پڑھتا رہتا تھا ۔اس کی بڑی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ان میں بیٹھے، ڈرائیو کرے اور لطف اٹھائے۔

آج اس کے پاس اتنے پیسے ہو گئے ہیں کہ وہ ایک نئی گاڑی بڑی آسانی سے خرید سکتا ہے۔اس کے کئی ایسے دوست ہیں جنہوں نے بزنس میں اتنی کمائی کی ہے کہ ہر سال بیوی بچوں کے لئے نئی نئی گاڑیاں خریدتے ہیں۔

حال ہی میں آیا ہوا بی ایم کا ایک نیا ماڈل اظہار کو پسند آگیا۔وہ اسے دیکھنے شو روم (showroom) میں گیا۔جب سیلس مین(salesman) کو اپنا کارڈ دیا تواس نے فوراً اظہار سے کہا: ”مسٹر اظہار آپ اسی وقت ایک گاڑی ٹرائیل(trial) کے لئے لے لیجیے ۔آپ گاڑی پورے ایک دن کے لئے رکھ سکتے ہیں۔“ مگر اظہار نے یہ جواب دیا کہ اسے صرف اپنے والد اور والدہ کو دکھا کر لانا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ سیلس مین بھی اس کے ساتھ چلے۔
”ان کو گاڑی پسند آ جائے گی تو آج ہی گاڑی لے لوں گا۔“ اظہار نے کہا۔

اظہار نے اپنی مرسی ڈیز گاڑی جو چارسال پرانی تھی شوروم

کے پارکنگ(parking) میں چھوڑی اور سیلس مین کے ہمراہ نئی بی ایم ڈرائیو کرتا ہوا جب ہائی وے(highway) پر آیا تو اسے نہ رفتار کا احساس تھا اور نہ ہی انجن کی آواز کا۔ پھر بھی وہ اسپیڈومیٹر(speedometer) پر ہر وقت نظر رکھتا رہا۔وہ بہت خوش تھا۔ایک گاڑی پاس سے گذری۔وہ ایک عزیز کی تھی۔اظہار کو دیکھ کر اس نے فورًا اپنی گاڑی کو آہستہ کیا اور انگوٹھا دکھا کر بہت بہت مبارک باد دی۔ ٹریفک لائٹ(Traffic light) پر اسے رکنا پڑا۔ سب لوگوں کی نظر اظہار پر تھی۔ایک لڑکے نے اشارے سے اجازت لے کر اپنے سیل فون سے گاڑی کی کئی تصویریں لیں۔

جب گھر پہنچے تو گاڑی راستے ہی میں کھڑی کر دی۔ کئی لوگ نئی گاڑی کو دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے اور سیلس مین سے گاڑی کے بارے طرح طرح کے سوالات پوچھتے رہے مگر اس نے گاڑی کی قیمت نہیں بتائی۔

''بیٹا، کیا بات ہے؟تم اتنی جلدی گھر واپس آگئے۔'' اظہار کو دیکھتے ہی والدصاحب نے پوچھا۔

''ابّو مجھے ایک گاڑی پسند آگئی ہے۔ آپ کو اور امّی کو دکھانے کے لئے لایا ہوں۔اگر آپ اجازت دیں تو میں خرید لوں گا۔'' اظہار نے کہا۔

اتنے میں امی بھی آ گئیں۔اظہار نے ضد کی کہ دونوں گاڑی میں تھوڑی دیر کے لئے سیر کرنے جائیں تاکہ ان کو اندازہ ہو جائے کہ گاڑی کیسی ہے۔

''بیٹا، گاڑی بہت خوبصورت اور اچھی ہے۔'' امی نے کہا۔

''خدا تمہیں یہ گاڑی مبارک کرے! واقعی یہ گاڑی بہت اچھی ہے۔تمہیں تو پسند ہے؟'' والد صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں ابو'' اظہار نے کہا۔

والدصاحب دیکھ رہے تھے کہ اظہار گاڑی چلاتے وقت کتنا خوش نظر آرہا تھا۔

''کیا تم لوگوں کو دکھانے کے لئے یہ گاڑی خرید رہے ہو؟ ایسا نہ ہو کہ گاڑی چلاتے وقت تم میں غرور آجائے۔'' والد صاحب نے کہا۔

'' نہیں ابو، غرور کیوں آئے گا؟ یہ تو آپ دونوں کی دعاؤں کی بدولت میں اس قابل ہوا ہوں کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' اظہار کہہ ہی رہا تھا کہ والد صاحب نے کہا: ''تمہیں پسند ہے تو گاڑی لے لو''۔

جب گھر واپس آئے تو والد نے پوچھا: ''بیٹا، تمہاری پرانی گاڑی میں کوئی خرابی آگئی ہے کیا؟''۔

''نہیں ابو۔وہ بالکل ٹھیک ہے۔ابو یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' اظہار نے پوچھا۔

''بیٹا، یہاں سے کچھ دور ایک گاؤں میں ایک مسجد بن رہی ہے۔وہاں کے لوگوں کے پاس اب اتنے پیسے باقی نہ رہے کہ وہ مسجد کی تعمیر جلد مکمل کرسکیں تاکہ لوگ وہاں نماز ادا کر سکیں۔'' والد صاحب نے کہا۔

اظہار والد صاحب کی بات سمجھ گیا اور گاڑی کو دیکھتا رہا۔

□□□

ناجو خالہ

ناجو خالہ اپنی سہیلی دھنو چاچی کے ساتھ ہر روز ایک ہاتھ میں ٹاٹ کی ایک پرانی بوری لیے اور کاندھے پر درانتی ٹانگے کھیتوں کی طرف جاتی نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں ساٹھ سال کی عمر سے زیادہ لگتی ہیں۔ دونوں اب بیوہ ہوگئی ہیں۔ پہلے دونوں ایک دوسرے کو صرف جانتی تھیں مگر حالات نے دونوں کو ایک دوسرے کو اس طرح قریب کر دیا ہے کہ اب ہر روز ایک ساتھ کھیتوں کی طرف جاتی ہیں۔ دراصل وہ کھیت میں کام کرنے نہیں جاتی ہیں۔ بھلا اس عمر میں ان کو کون کام دے گا۔ دونوں کھیت میں گھاس کاٹنے جاتی ہیں۔

دونوں نے تین تین بکریاں پال رکھی ہیں۔ ان ہی بکریوں کا چارہ ڈھونڈنے کے لئے سورج نکلنے کے کافی دیر بعد وہ کھیتوں میں جاتی ہیں۔ گھاس ڈھونڈ ڈھونڈ کر کاٹتی ہیں اور اسے اپنی اپنی بوری میں ڈالتی جاتی ہیں۔ جب بوری اتنی بھر جاتی ہے اس کا وزن وہ اٹھا سکیں تو ایک دوسرے کی مدد سے سر پر رکھتی ہیں اور گھر واپس آکر طویلے کے قریب رکھ دیتی ہیں۔ بکریاں ناجو خالہ کو

دیکھتے ہی میں میں کرنے لگتی ہیں۔

''صبر کرو۔ صبر کرو۔ میں ابھی تمہیں گھاس دیتی ہوں۔ جانے سے پہلے تو گھاس دے کر گئی تھی۔ پھر سے اتنی بھوک لگ گئی ہے۔'' خالہ ہر روز یہ جملہ دہراتی ہیں مگر بکریاں چلاتی رہتی ہیں۔ ناجو خالہ پانی پینے تک نہیں جاتی ہیں۔ فوراً بوری کھولتی ہیں اور تھوڑی گھاس نکال کر بکریوں کے سامنے رکھ دیتی ہیں اور کہتی ہیں: ''لو۔ کھالو مگر اب شام ہی کو چارہ دوں گی۔'' ہر روز یہی کہتی ہیں ۔ چند گھنٹوں کے بعد جب بکریاں دوبارہ 'میں میں' کرنے لگتی ہیں تو ناجو خالہ ان کے سامنے گھاس رکھ کر آجاتی ہیں اور اپنے کام میں پھر سے لگ جاتی ہیں۔

حالانکہ ناجو خالہ کا مکان چھوٹا ہے پھر بھی میں گھر کام تو رہتا ہی ہے۔ مکان میں دو کمرے ہیں اور ایک برآمدہ۔ ایک کمرہ ان کے باورچی خانے کا کام دیتا ہے اور دوسرے میں وہ سوتی ہیں۔ اس کمرے میں ایک مسہری، ایک میز اور چار کرسیاں ہیں۔ ایک کونے میں ٹیک سے بنی ایک پرانی الماری ہے جس میں وہ اپنے کپڑے اور ادھر ادھر کا سامان رکھتی ہیں۔ دیوار پر چند تصویریں لٹکی ہوئی ہیں جن میں ایک تصویر ان کے شوہر کی ہے۔ سر پر ترکی ٹوپی، پتلون قمیص اور کوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ کوٹ کے ایک بٹن سے لٹکی ہوئی ایک چین کوٹ کی اوپری جیب میں گھسی ہوئی ہے۔ اس زمانے کے امیروں کا یہ فیشن تھا۔ دراصل اس سونے کے چین سے ایک گھڑی لگی ہوئی ہوتی ہے جو کوٹ کی اوپری جیب میں رکھی جاتی ہے۔ شاید اس زمانے میں ہاتھ کی گھڑی نہیں

تھی۔ایک اور تصویر تھی جس میں ناجو خالہ اور خالو ایک موٹر کے قریب کھڑے ہیں۔خالہ کے کپڑوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنی امیر تھی۔

واقعی ناجو خالہ نے بڑے اچھے دن دیکھے تھے۔اس زمانے میں جب گنے چنے لوگوں کے پاس کاریں تھیں تب ناجو خالہ اور ان کے شوہر ہر شام اپنی کار میں سیر کرنے جاتے تھے۔ان کا ایک ڈرائیور تھا کیونکہ خالو کو کار چلانا نہیں آتا تھا۔ان کا مکان بہت بڑا اور عالیشان تھا۔ان کے گھر میں کئی نوکرانیاں تھیں۔ان کے تین لڑکے تھے۔ مگر خالہ نے غربت بھی دیکھی تھی۔ ماں باپ دونوں دوسرے لوگوں کے کھیتوں میں مزدوری کرتے تھے۔گائے بکریاں بھی پالتے تھے۔بچپن میں ناجو خالہ اپنی ماں کے ساتھ دوپہر کے بعد گھاس کاٹنے جاتی تھیں۔اس لئے آج بھی ان کو معلوم ہے کہ بکریاں کس گھاس کو کھانا پسند کرتی ہیں۔

خالو بھی امیر نہیں تھے۔جب دونوں کی شادی ہوئی تو دو تین ہفتوں کے بعد ہی خالو اور خالہ کھیت میں مزدوری کے لئے جانے لگے اور شام ہونے سے پہلے بکریوں کے لئے سر پر گھاس اٹھائے گھر واپس آتے تھے۔جب ان کے پاس تھوڑا پیسہ جمع ہو گیا تو خالو نے قرض لے کر دو بیگھے زمین خرید لی۔ اور اس میں سبزیاں بونے لگے۔رات دن محنت کرتے تھے۔بعض اوقات دن بھر کھیت ہی میں رہتے تھے۔ڈوبتے سورج کو دیکھتے دیکھتے گھر واپس آتے۔کبھی کبھار خالو سبزیاں بازار میں بیچنے جاتے مگر اکثر اوقات ان کا ایک دوست اپنی بیل گاڑی میں سبزیاں شہر لے جا کر بیچتا

تھا کیونکہ خالو کو کھیت میں رہنا پڑتا تھا۔

آمدنی بڑھتی گئی مگر دونوں برابر محنت کرتے رہے۔ اب ان کے پاس اتنے پیسے ہو گئے کہ انہوں نے اور زمینیں خرید لیں۔کام اتنا بڑھ گیا کہ مزدوروں کو لینا پڑا۔ ادھر خالو نے خالہ کو گھر پر رہنے کو کہا تاکہ وہ بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں مگر خالہ کو جونہی موقع ملتا تھا وہ خریدی ہوئی پہلی زمین کو دیکھنے جاتی تھیں۔وہاں جانے کی کئی وجوہات تھیں۔رات دن محنت کرنے کے بعد انہیں وہ کھیت خریدنے میں بڑی خوشی ہوئی تھی۔اسی کھیت سے ان کی آمدنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ دوسری اور زمینیں خرید پائیں، بڑا مکان بنایا اورایک گاڑی بھی خریدی۔لیکن سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ یہ کھیت گھر سے بہت قریب تھا۔ ناجو خالہ جب چاہتیں وہاں چلی جاتیں۔مزدوروں سے بات چیت کرتیں۔ بعض اوقات تھوڑی دیر کے لئے کام بھی کرتیں۔وہاں جا کر وہ بہت خوش ہوتی تھیں۔

ایک دن اچانک خالو کی طبیعت خراب ہوگئی۔بڑا لڑکا اپنی گاڑی میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔دوا دی گئی۔مگر خالو کی طبیعت خراب ہی رہی۔ایک دوست نے خالو کو مشورہ دیا کہ جائداد بچوں میں تقسیم کر دے ورنہ آپس میں جھگڑا ہوگا اور کورٹ کچہری میں بہت پیسہ لگ جائے گا۔دوست کے مشورے پر خالو نے عمل کیا اور زمین بچوں میں تقسیم کر دی مگر گھر ناجو خالہ کے نام کر دیا۔ بچوں سے کہہ دیا کہ وہ ماں کی دیکھ بھال کریں۔

خالو چل بسے۔چند دنوں کے لئے بچوں نے خالہ کی خوب

خدمت کی مگر اب بہت جلد ہی ان کے بہت سے دوست ہو گئے جن کے ساتھ وہ عیاشی میں ڈوب گئے۔کھیت آمدنی کا ذریعہ ہونے کے بجائے قرض لینے کے لئے کام آنے لگا۔آخرکار کھیتوں پر ساہوکاروں نے قبضہ جما لیا اور اپنے پیسے وصول کرنے کے لئے کھیتوں کو بیچ ڈالا۔خالہ کو جو ڈر تھا وہی ہوا۔ایک دن کسی نے آ کر ان کو بتایا کہ وہ کھیت جو انہیں بہت عزیز تھا بک گیا ہے۔ ناجو خالہ کو بڑا جھٹکا لگا۔

" بیٹا تم نے بہت غلط کیا۔ مجھے بتا دیا ہوتا۔میں کچھ انتظام کر دیتی"۔ناجو خالہ نے کہا۔

" ماں اگر وہ کھیت نہیں بیچتا تو یہ گھر چلا جاتا" بیٹے نے کہا۔

"اب سے سدھر جاؤ۔اپنی بیوی بچوں کے بارے میں سوچو۔ہم نے کتنی محنت سے سب کچھ حاصل کیا تھا۔ابھی تمہارے والد کے گذرے ہوئے تین سال بھی نہیں ہوئے ہیں اور مجھے یہ سب کچھ دیکھنا پڑ رہا ہے۔" خالہ نے کہا۔

خالہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں۔

دوسرے لڑکے نے بھی عیاشی کے لئے کھیتوں کو گروی رکھ دیا تھا۔جس کا ڈر تھا پھر وہی ہوا۔کھیتوں پر ساہوکار نے قبضہ کر لیا۔ یہ کھیت بھی بک گئے۔

ایک روز سب سے چھوٹے لڑکے نے ماں سے کہا: "ماں آج کل ٹیکسی چلانے میں بہت فائدہ ہو رہا ہے۔میں ایک ٹیکسی خریدنا چاہتا ہوں۔بس آپ مجھے تھوڑا پیسہ دیجیے۔"

''میں پیسہ کہاں سے لاؤں؟'' ناجو خالہ نے کہا۔
''بس اس کاغذ پر انگوٹھا لگا دیجئے۔ مجھے پیسہ مل جائے گا۔'' لڑکے نے کہا۔
'' نہیں ۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ انگوٹھا کبھی نہیں لگاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے تم بھی اپنے بھائیوں کی طرح کرو گے۔ بیٹا ہم نے کتنی محنت سے یہ گھر بنایا ہے اور تمہارے بھائی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اور تم بھی اپنی بیوی بچوں سمیت اسی گھر میں رہتے ہو۔'' خالہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
ٹیکسی خریدی گئی۔ دو سال بعد ایک آدمی ایک پولیس افسر کے ساتھ آیا اور گھر خالی کرنے کو کہا۔ خالہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آدمی نے بتایا کہ اب گھر اس کا ہو گیا ہے کیونکہ قرض ادا نہیں کیا گیا ہے۔
''مگر یہ گھر تو میرا ہے۔ میں نے کبھی کسی کاغذ پر انگوٹھا نہیں لگایا ہے۔'' ناجو خالہ نے کہا۔
''اگر آپ ایسا کہہ رہی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی جگہ کسی اور نے انگوٹھا لگایا ہے۔ اس جال سازی کے لئے آپ کے بیٹے کو سات سال قید کی سزا ہوگی۔ بس آپ میرے ساتھ چل کر پولیس اسٹیشن میں بیان دیجیے۔'' پولیس افسر نے کہا۔
ایک ماں کہاں چاہے گی کہ اس کا بیٹا جیل جائے۔
ناجو خالہ کو اپنا ہی گھر چھوڑنا پڑا۔ تینوں لڑکے ادھر ادھر چلے گئے۔ کسی نے ماں کو اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ تین چار دنوں کے لئے خالہ کو دور کے ایک رشتہ دار کے یہاں رہنا

پڑا۔وہیں پر ان کو پتہ چلا کہ قریب ہی میں ایک چھوٹا سا گھر بک رہا ہے۔خالہ نے اپنے بچوں کو کبھی نہیں بتایا تھا کہ ان کے پاس پانچ ہزار روپے پہلے سے جمع کیے ہوئے تھے۔اپنے چند زیورات بیچ کر انہوں نے وہ گھر خرید لیا اور وہیں رہنے چلی گئیں۔ان کے پڑوس میں دھنو چاچی رہتی تھیں۔ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ایک سال پہلے ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اب وہ بکریاں اور مرغیاں پال کر اپنا گذارا کر لیتی تھیں۔ دھنو چاچی نے ناجو خالہ کو اچھے کپڑے اور زیورات پہنے ہوئے دیکھا تھا مگر کبھی دونوں ملی نہیں تھیں۔

جب ناجو خالہ اپنے نئے گھر میں آئیں تو سب سے پہلے دھنو چاچی ان سے ملنے آئیں اور کہا: ”بہن میں برابر میں رہتی ہوں۔آپ کو جانتی ہوں۔اب آپ مجھے اپنی بہن کی طرح مانیں۔فکر نہ کریں۔بالکل پریشان مت ہوں۔بھگوان سب ٹھیک کر دے گا۔“

اگلے روز صبح سویرے دھنو چاچی درانتی اور ٹاٹ کی بوری لئے ہوئے اپنے گھر سے نکل رہی تھیں تو ناجو خالہ ان سے ملنے آگئیں اور پوچھا ”کہاں جا رہی ہو۔“

”بس کھیتوں کی طرف جا رہی ہوں۔ان بکریوں کے لئے گھاس ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔“دھنو چاچی نے کہا

”میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ چلوں۔“ ناجو خالہ نے کہا۔

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔گھر بند کر کے آجایئے۔میں

آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔'' دھنو چاچی نے یہ سوچ کر کہا کہ ناجو خالہ کو ٹہلنے کا موقع مل جائے گا۔دونوں گھر سے نکل پڑیں۔ایک پگڈنڈی سے گذرتے ہوئے جا رہی تھیں۔''میں دوتین بکریاں خریدنا چاہتی ہوں۔'' چلتے چلتے ناجو خالہ نے کہا۔

'' آپ کیوں خریدیں گی۔میرے پاس کئی بکریاں ہیں ۔ ادھیا میں لے لیجیے یعنی آپ بکری لے کر پالیے اور جب اس کے بچے ہونگے تو مجھے میری بکری واپس کردیجیے اور بچوں کو رکھ لیجیے ۔'' دھنو چاچی نے کہا۔

دھنو چاچی کو اندازہ تھا کہ ناجو خالہ کتنی امیر تھیں۔ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ خالہ کو ایک بکری مفت میں دے دیں مگر خالہ کو ٹھیس نہیں پہنچانا نہیں چاہتی تھیں۔''بہن آپ لے لیجئے۔''

'' میرے پاس پیسے ہیں۔تمھیں پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ میں دو خرید لیتی ہوں اور تم ایک ادھیا میں دے دو۔ چلو اب ہم دوبارہ وہی زندگی شروع کریں جو پہلے تھی لیکن دھنو مجھ میں اب وہ طاقت نہیں جو پہلے تھی۔میرے بچوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔خیر چھوڑو ان باتوں کو۔'' ناجو خالہ نے کہا۔

'' کاش آپ کے بچوں کو اندازہ ہوتا کہ آپ دونوں نے کتنی محنت کی تھی!'' دھنو چاچی نے کہا۔

اگلے روز خالہ بھی ایک ہاتھ میں ٹاٹ کی بوری اور دوسرے میں ایک درانتی لیے ہوئے دھنو چاچی کے ساتھ کھیت کی طرف چلیں۔

''دھنو چلو۔میں تمھیں وہ کھیت دکھاتی ہوں جو ہمارا پہلا

کھیت تھا۔وہ مجھے اب بھی بہت پسند ہے۔''خالہ نے کہا۔

''وہاں جانے سے کیا فائدہ۔جو ہو گیا سو ہو گیا۔وہاں جانے سے بلاوجہ آپ کو تکلیف ہوگی۔چلیے۔ اس طرف چلتے ہیں۔'' دھنو چاچی نے کہا۔

''نہیں دھنو چلو اُدھر ہی چلتے ہیں۔وہ کھیت دیکھنے کو میرا بہت جی چاہ رہا ہے۔''خالہ نے کہا۔

کھیت کے قریب پہنچے تو ایک آدمی ان کی طرف تیزی سے آتا ہوا نظر آیا۔دونوں گھبرا گئیں۔

''السلام علیکم خالہ۔نمستے چاچی۔ آپ دونوں ادھر کہاں جا رہی ہیں؟'' اس آدمی نے قریب آکر پوچھا۔

'' ارے داوٗد تم ہو! ہم تو ڈر ہی گئے تھے۔آج تم یہیں کام کر رہے ہو؟'' خالہ نے کہا۔

''جی ہاں خالہ، ''داوٗد نے جواب دیا۔

'' داوٗد یہ زمین اب کس کی ہے؟ کس نے خریدی ہے؟'' ناجو خالہ نے پوچھا۔

'' بہن آپ کو نہیں معلوم ۔یہ زمین تو داوٗد ہی نے خریدی ہے۔'' دھنو چاچی نے بتایا۔

'' داوٗد میں بہت خوش ہوں کہ تم اس زمین کے مالک ہو۔یاد ہے اس میں کتنی سبزیاں اگتی تھیں۔تم نے اسی کھیت میں کام کرنا شروع کیا تھا۔اس وقت تم بہت چھوٹے تھے۔تم ہمارے وفادار مزدور تھے۔ہم دونوں تمہیں بہت پسند کرتے تھے۔ اب مجھے بہت اطمینان ہے کہ اس زمین کے مالک تم ہو کوئی اور نہیں۔بیٹا

اللہ تمہیں برکت دے۔اس کھیت کو تم کبھی نہ بیچنا۔دیکھنا یہ زمین جلدہی تمہیں بہت دولتمند بنا دے گی۔'' خالہ کے چہرے سے اطمینان اور خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔

'' خالہ یہ کھیت آپ ہی کا ہے۔جب چاہیں آپ آ سکتی ہیں۔جو بھی سبزی چاہیے اور جتنی بھی آپ لے جا سکتی ہیں۔میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔میں تو یہ بھی چاہتا ہوں کہ یہ کھیت آپ کو واپس کردوں۔'' داؤد نے کہا۔

یہ سن کر ناجو خالہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ نہیں کہہ پا رہی تھیں۔چند لمحوں کے بعد خالہ نے کہا'' داؤد تم نے جو کچھ کہا سمجھ لو میں نے اسے قبول کر لیا۔ایک تم ہو کہ اپنی خریدی ہوئی زمین دینا چاہتے ہو اور وہ میرے تین بیٹے ہیں جنہوں نے زندگی بھر کی ہماری کمائی ہوئی جائداد تین برسوں ہی میں لٹا دی۔خیر یہ اللہ کی مرضی تھی۔''

'' خالہ میں ابھی زندہ ہوں۔آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو جو چاہیے مجھے بتا دیجیے۔آپ کو فوراً مل جائے گا۔ یہ بتائیے آپ بوری اور درانتی لیے کہاں جا رہی تھیں؟'' داؤد نے پوچھا۔

'' اب ناجو بہن میرے پڑوس میں رہتی ہیں۔'' دھنو چاچی نے کہا۔

'' داؤد میں کیا بتاؤں ۔ میرے لڑکوں نے سب کچھ لٹا دیا۔یہاں تک کہ گھر بھی نہ چھوڑا۔ تمہارے خالو نے خدا کا شکر ہے کچھ پیسے دیے تھے۔اسی سے دھنو کے مکان کے برابر میں

میں نے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا ہے۔اب وہیں رہتی ہوں۔میرے پاس تین بکریاں ہیں۔ان ہی کے لئے گھاس کاٹنے جا رہی ہوں۔اجازت دو تو تمہارے ہی کھیت میں سے گھاس کاٹ لوں۔" خالہ نے کہا۔

" خالہ یہ کھیت آپ ہی کا ہے تو پھر اجازت کیسی۔آپ جب بھی چاہیں کھیت میں آجائیں اور جو چاہیے آپ لے لیں۔ دھنو چاچی آپ بھی۔سبزیاں بھی لے لیجیے۔" داؤد نے کہا۔

جب یہ دونوں گھاس کاٹ رہی تھیں داؤد نے ڈھیر سارے ٹماٹر، بینگن، کدو، کریلے اور دوسری سبزیاں توڑ کر جمع کر دیں۔

" خالہ لائیے آپ دونوں کے لئے گھاس کاٹ دیتا ہوں۔" داؤد نے کہا۔

" نہیں بیٹا ہم خود ہی کاٹ لیں گے۔" ناجو خالہ نے کہا۔

داؤد نے ناجو خالہ سے درانتی مانگی اور تھوڑی ہی دیر میں کافی گھاس کاٹ کر لے آیا۔بوری میں گھاس ڈالتے ہوئے کہا: "خالہ میں آپ کے گھر یہ بوری لے آؤں گا۔ہاں۔ یہ سبزیاں ہیں۔ آپ دونوں کے لئے ہیں۔"

" بیٹا۔بوریاں تو ہم سر پر رکھ کر لے جائیں گے اور ہاں یہ سبزیاں بہت ہیں۔ ہم اتنی ساری سبزیوں کا کیا کریں گے۔" ناجو خالہ نے کہا۔

داؤد نے کچھ نہیں کہا۔بس دونوں تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کی مدد سے اپنی اپنی بوری سر پر اٹھا کر رکھنے جا رہی تھیں

کہ داؤد بولا: ''خالہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔آپ بوری یہیں چھوڑ دیں۔میں آپ کے گھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''نہیں بیٹا۔ہم تو سرپر بوری لے جانے کے عادی ہیں۔مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔بس اب تم جاؤ ۔اپنا کام کرو۔ دیکھو وہاں پر پودوں کی جڑوں پرمٹی ڈالنا ہے۔یاد رکھو وہاں ہمیشہ مٹی ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔تمہیں یاد ہے ہم ہمیشہ یہی کرتے تھے۔'' ناجو خالہ نے کہا۔

دونوں سہیلیاں سر پر بوری اٹھائے گھر واپس آگئیں۔داؤد نے جان بوجھ کر ان کو سبزیاں اپنے ساتھ لے جانے کو نہیں کہا۔دراصل خالہ سبزیاں لینا نہیں چاہتی تھیں۔انہیں معلوم تھا کہ کس طرح سے تھوڑی سبزیاں بیچ کر بھی پیسے جمع ہو سکتے ہیں۔داؤد کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

جب دونوں گھر پہنچیں تو بکریاں منمنانے لگیں۔ ناجو خالہ نے پھر یہی جملے دہرائے: ''صبرکرو۔صبرکرو۔ابھی گھاس دیتی ہوں۔ جانے سے پہلے گھاس دے دی تھی۔ صبرکرو۔'' بوری کھول کر ایک مٹھی گھاس نکال کر دے دی اور بکریاں چپ چاپ کھانے لگیں۔

پھر ناجو خالہ منہ ہاتھ دھو کرپانی پینے کے لئے بیٹھ گئیں کہ داؤد سائیکل پر ایک بوری لئے آ گیا۔

''داؤد آؤ بیٹھو۔میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔'' ناجو خالہ نے کہا۔

داؤدنے خالہ کو سبزیاں دیں۔

"داؤد اتنی سبزیوں کا میں کیا کروں گی؟" خالہ نے کہا۔

" آپ کچھ دھنو چاچی کو دے دیجیے۔" داؤد نے کہا۔

" وہ بھی تو اکیلی ہے۔ہم دونوں کو جتنی ضرورت پڑے گی۔لے لیتے ہیں۔باقی تم بیچ دو۔" خالہ نے کہا۔

دراصل داؤد اتنی سبزیاں اسی لئے لایا تھا کہ خالہ انہیں بیچ دیں تاکہ ان کو کچھ پیسے مل جائے۔داؤد نے بہت ضد کی کہ خالہ تمام سبزیاں رکھ لیں۔آخرکار خالہ کو لینی ہی پڑیں۔انہوں نے دھنو چاچی کو کچھ دیں اور باقی آس پاس کے غریب لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

اگلے روز داؤد کی بیوی گھر سے کچھ پکا کر لائی۔خالہ داؤد کو تو منع کرتیں مگر بہو کو کیسے انکار کر سکتی تھیں۔ اب اسی طرح داؤد کی بیوی خالہ کے لئے اکثر کچھ پکا کر لاتی تھی۔

"ناجو آج کدھر گھاس کاٹنے چلیں گے؟" دھنو چاچی نے گھر سے نکلتے وقت کہا۔

" چلو۔داؤد ہی کے کھیت کی طرف چلتے ہیں۔اس کھیت میں جانے سے مجھے بہت سکون ملتا ہے۔ دھنو یہ ہمارا خریدا ہوا پہلا کھیت ہے۔قرض لے کر خریدا تھا مگر اس کھیت نے ہمیں اتنی سبزیاں دیں کہ دو ہی برسوں میں پورا قرض ادا ہو گیا۔" خالہ نے کہا۔

" اس کھیت سے آپ کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔وہاں جانے سے آپ کو تکلیف ہوگی۔چلو ہم کہیں اور چلتے ہیں۔" دھنو چاچی نے کہا۔

"یادوں ہی کے سہارے تو اب جی رہی ہوں۔بچوں نے ہمارا سب کچھ گنوا دیا۔ بس مجھ سے میری یادیں نہیں چھین سکے۔ لیکن مجھے ان یادوں ہی میں کھو کر نہیں جینا ہے اسی لئے میں پھر سے گھاس کاٹنے جاتی ہوں۔ کچھ آمدنی تو ہوجائے گی۔ میرے لئے بکریاں پالنا اور گھاس کاٹنا کوئی شرم کی بات نہیں۔" خالہ نے کہا۔

دھنو چاچی بے بس ہوگئیں۔انہیں اندازہ ہوگیا کہ ناجو خالہ داؤد ہی کے کھیت میں جانا چاہتی ہیں۔دونوں اسی کھیت کی طرف چل پڑیں۔

کھیت میں دونوں داخل ہوئیں۔بوری رکھ کر درانتی سے گھاس کاٹنے لگیں۔اتنے میں ایک آدمی چلاتے ہوئے آیا اور کہا: "تم دونوں اس کھیت میں سبزیاں چرانے آئی ہو۔ جلد سے جلد نکل جاؤ ورنہ مجھ سے برا اور کوئی نہیں ہوگا۔اس کھیت کو باپ کی ملکیت سمجھ رکھا ہے کیا؟"

آدمی کی بات سن دونوں کو بہت حیرت ہوئی۔

"تم اس کھیت کے نئے مالک ہو کیا؟" ناجو خالہ نے پوچھا۔

"نہیں مالک تو نہیں ہوں مگر میں یہیں کام کرتا ہوں۔ تم دونوں یہاں سے جلدی چلی جاؤ۔سبزیاں کھانی ہو تو خرید کر کھاؤ۔چوری کیوں کرتی ہو؟" اس آدمی نے بڑے ترش لہجے میں کہا۔

"دیکھو۔ہم چوری کرنے نہیں آئے ہیں ۔ہم تو گھاس

کاٹنے آئے ہیں اور ہمیشہ یہاں آتے ہیں۔داؤد سے پوچھ لو۔''
دھنو چاچی نے کہا۔
''تم دونوں یہاں سے جاتی ہو یا نہیں؟''اس آدمی نے کہا۔
''دھنو۔چلو۔ایسے لوگوں سے منہ نہیں لگتے ہیں۔'' خالہ نے کہا پھر اس آدمی سے کہا: ''داؤد سے کہہ دینا کہ ناجو خالہ آئی تھیں اور تم نے انہیں کھیت سے نکال دیا۔''
دونوں ایک دوسرے کھیت میں جا کر گھاس کاٹنے لگیں اور بوریوں میں بھرتی گئیں۔جب ایک دوسرے کے سر پر بوری رکھنے کی مدد کرنے لگیں تو داؤد کو اپنی طرف دوڑکر آتے دیکھا۔

'' خالہ۔خالہ رک جائیے۔میں معافی چاہتا ہوں ۔وہ ایک نیا مزدور ہے۔ایک دوسرے گاؤں سے آیا ہے۔اسے نہیں معلوم کہ آپ کون ہیں۔چلیے۔ پھر سے کھیت میں چلیے۔وہ مزدور آپ دونوں سے معافی مانگ رہا ہے۔''داؤد نے ہانپتے ہانپتے کہا۔
''بیٹا کوئی بات نہیں۔مجھے یقین ہے کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم کون ہیں۔ اس نے اپنا کام کیا مگر اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ ہم چوری کرنے آئے ہیں۔'' خالہ نے کہا۔
''خالہ آپ اسے معاف کر دیجیے اور میرے ساتھ چلیے۔یہ کھیت آپ ہی کا ہے۔'' داؤد نے کہا۔
'' بیٹا۔ یہ تمہاری محبت ہے جو تم مجھے اتنی عزت دے رہے ہو۔ میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔'' خالہ نے کہا۔
'' خالہ آپ تھوڑی دیر کے لئے کھیت میں چلیے ورنہ میں

سمجھوں گا کہ آپ مجھ سے بھی ناراض ہو گئی ہیں۔" داؤد نے کہا۔

"نہیں بیٹا میں تم سے کیسے ناراض ہو سکتی ہوں۔ تم میرا اتنا خیال کرتے ہو۔اچھا تم جاؤ ۔کھیت کی دیکھ بھال اچھی طرح سے کرنا۔ اسے کسی حالت میں نہ بیچنا۔ خدا تمہیں اتنی برکت دے جتنی ہمیں دی تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ مگر جیتے جی اس کھیت کو کسی اور کے ہاتھ نہ سونپنا۔اچھا اب ہمیں جانے دو۔" خالہ نے کہا۔

داؤد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔وہ کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔

گھر واپس جاتے وقت ناجو خالہ نے دھنو چاچی سے کہا: " غلطی میرے ہی تھی۔مجھے اس کھیت سے ناطہ توڑ دینا چاہیے تھا اور سوچ لینا تھا کہ اب وہ کھیت میرا نہیں ہے۔پر کیا کریں ۔یادیں ہی تو اس عمر میں سہارا بن جاتی ہیں۔"

دو دنوں کے بعد ناجو خالہ اور دھنو چاچی پھر اسی کھیت کی طرف جاتے ہوئے نظر آئیں۔

❑❑❑

نایاب تحفہ

دیکھتے ہی دیکھتے خالہ کا گھر کرائے داروں سے بھر گیا۔پورٹ لوئس کے لابوردونے اسٹریٹ (Labourdonnais street کے اس پرانے مکان میں اتنے کمرے تھے جتنے کہ کرایہ دار۔دراصل اس گھر کے کمرے بڑے تھے ۔کرایہ پر دینے کے لئے نہیں تھے۔ خالو نے کبھی مکان کرائے پر دینے کے لئے نہیں سوچا تھا اس لئے انہوں نے کمروں کو اتنا بڑا بنوایا تھا ۔

مگر خالہ ان بڑے کمروں کو جب کرائے پر دیتی ہیں تو اتنا ہی کرایہ لیتی ہیں جو ایک چھوٹے سے کمرے کا ہوتا ہے۔کرایہ داروں میں سب ہی غریب ہیں۔ ان کے لئے ایک ہی بڑا کمرہ کافی ہے جس میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ گزارا کر لیتے ہیں۔کئی لوگوں نے خالہ سے کہا بھی تھا کہ اگر کمروں کو کرائے پر دینا ہی ہے تو ہر کمرے کو دو یا تین کمروں میں ڈھال دیں۔ اس طرح خالہ کو زیادہ پیسے مل سکتے ہیں۔لیکن خالہ نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ انہیں کرائے داروں کے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے اپنے گھر میں

کرایہ داروں کو رکھا ہے۔

خالو کے انتقال کے بعد خالہ ایک دم اکیلی ہو گئی تھیں۔ ان کا بیٹا یوسف نوکری کی وجہ سے انگلینڈ چلا گیا تھا جہاں وہ کسی ہسپتال میں نرسنگ افسر تھا۔

''خالہ آج یوسف کا کوئی خط نہیں آیا ہے؟'' میں نے ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

خالہ اب پورے گھر میں رہنے کے بجائے صرف ایک کمرے اور اس کے ساتھ لگے برآمدے کو استعمال کرتی ہیں اور جب بھی میں وہاں جاتا ہوں تو کرائے داروں کے دو تین بچے ان کے پاس کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خالہ کا خط لکھنا اور پڑھنا میرا ہی کام تھا۔اسی لئے مجھے ہر ہفتہ ایک بار ان کے یہاں جانا پڑتا ہے۔جس روز یوسف کا خط آتا ہے خالہ بہت ہی بیتاب نظر آتی ہیں۔ اکثر یہ کہتی ہیں: ''آج تم نے بڑی دیر لگا دی ہے۔'' حالانکہ میں تقریباً اسی وقت وہاں پہنچتا تھا۔

خالہ بڑی بے چینی سے مجھے خط پڑھتے ہوئے سنتیں۔خالو کو یوسف انگریزی میں خط لکھتا تھا۔ اب وہ نہ رہے تب بھی یوسف نے خالہ کو انگریزی ہی میں خط لکھنا جاری رکھا۔مجھے خالہ پر ترس آنے لگا۔بیچاری کو پڑھنا ہی نہیں آتا اور اگرکوئی خط پڑھ کر سنائے بھی تو زبان ایسی ہوتی ہے جو وہ سمجھ نہیں پاتیں۔ خط کے ترجمے سے جذبات اور خیالات سے جو نا انصافی ہوتی ہے میں اسے اچھی طرح سے محسوس کرتا ہوں۔اسی لئے میں نے یوسف سے

صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی خاطر کریولی زبان میں خط لکھے۔ اردو میں لکھنے کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ یوسف تو اردو سمجھ سکتا ہے لیکن لکھ نہیں پاتا۔کریولی زبان میں خط سن کر خالہ بے حد خوش ہوئیں۔ اب تو خالہ اسی زبان میں خط لکھواتیں۔ کبھی کبھار میں سوچتا ہوں کہ ہمارے بزرگوں نے لڑکیوں کو لکھنا نہ سکھا کر ان پر بڑی زیادتی کی ہے۔

یوسف کو خط لکھواتے وقت جہاں خالہ اور چیزوں کی تاکید کرتی تھیں وہاں یہ لکھوانا نہیں بھولتیں کہ ''بیٹا جلدی واپس آجاؤ ورنہ میری لاش نہیں دیکھ پاؤ گے۔'' مگر یوسف کے خط میں واپس آنے کا بالکل ذکر نہیں ہوتا تھا۔جب خالو باحیات تھے تو انہوں نے اپنی بیماری کا تار بھیج کر اسے اپنے ہی خرچ پر بلایا تھا۔خالو نے لاکھ کہا: ''یوسف انگلینڈ واپس نہ جاؤ۔'' میری آنکھوں کے سامنے ابھی تک وہ منظر ہے جب میں نے خالو کو روتے ہوئے یوسف سے یہ کہتے سنا تھا: ''یوسف ہر ماں باپ کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے ان کی آنکھوں کے سامنے رہیں۔ اب تو تمہیں ڈپلوما بھی مل گیا ہے جس سے تمہیں یہیں کے ہسپتال میں بڑی آسانی سے نوکری مل سکتی ہے۔انگلینڈ کیوں جا رہے ہو؟''

'' پاپا، موریشس میں تنخواہ بہت کم ملتی ہے۔انگلینڈ میں ایک مہینے جو میں کما سکتا ہوں یہاں ایک سال میں بھی حاصل نہیں کر سکتا۔'' یوسف نے جواب دیا۔

'' بیٹا، زندگی میں پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔'' خالو نے

کہا۔

آخرکار خالو نے سوچا کہ اب آخری حربہ استعمال کیا جائے۔انہوں نے یوسف سے اس کی شادی کے بارے میں بات چھیڑی۔وہ سوچ رہے تھے کہ اپنا ایک فرض بھی پورا ہوجائے گا اور اس طرح یوسف بھی رک جائے گا۔۔

شادی کی بات سنتے ہی یوسف نے ایک دوسرا ڈپلوما کرنے کا بہانہ بنایا جس کی مدد سے اسے موریشس میں اچھی تنخواہ والی نوکری مل جائے گی۔خالو کی عادت نہیں تھی کہ اپنے لڑکے کی خواہش کے خلاف کچھ کہتے۔

خالو کےانتقال کے بعد خالہ کو امید تھی کہ یوسف واپس آجائے گا۔ میں نے خود ذاتی طور پر یوسف کو لکھا تھا کہ وہ ماں کی خدمت کے لئے لوٹ آئے۔کبھی امتحان کی تیاری کا اور کبھی چھٹی نہ ملنے کا بہانہ بنا کر نہ آنے کا جواز وہ پیش کرتا رہتا تھا۔ یوسف سے یہ امید نہیں تھی۔ بس وہ ہر مہینہ ماں کو پانچ پاؤنڈس پابندی سے بھیجتا رہتا۔اور یہ پانچ پاؤنڈس خالہ کرایہ دار کے بچوں میں خرچ کردیتی تھیں۔ان کا گذر تو سرکاری پنشن اور کرائے کے پیسوں سے ہو جاتا تھا۔

کئی بار انہوں نے مجھے خط میں لکھنے پر مجبور کیا تھا کہ ان کو پیسوں کی ضرورت نہیں ہے اور یوسف ان کو یہ پانچ پاؤنڈس نہ بھیجے۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ خالہ یہ بھی کہنا چاہتی تھیں کہ اگر یوسف واپس نہیں آنا چاہتا ہے تو انہیں اس کے پیسے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔مگر یہ اس لئے نہیں لکھواتیں کہ اس سے

یوسف کو تکلیف نہ پہنچے۔ایک مرتبہ ضد کرکے خالہ نے لکھوایا تھا کہ یوسف انہیں پیسہ نہ بھیجے تو شاید یوسف کو احساس ہوا تھا کہ خالہ اس سے ناراض ہے۔ جواب میں اس نے خالہ سے کہا تھا کہ وہ اسے انگلینڈ بلانے کا انتظام کر رہا ہے۔ خالہ وہاں جانے کو ہر گز تیار نہیں تھیں۔بھلا ان کو کیسے یہ گوارا ہو سکتا کہ وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر دوسروں کے گھر میں رہے۔

پھر انہوں نے سوچا کہ شاید یوسف ان کو اس لئے بلا رہا ہے کہ وہ تنہا رہتا ہوگا۔جب ایک کرایہ دار کی بیوی نے خالہ کو مشورہ دیا کہ یوسف کے لئے لڑکی ڈھونڈی جائے اور یوسف کو بلا کر اس کی شادی کر دی جائے تو خالہ کو یہ بات بہت پسند آئی اور وہ بہو کے بارے میں سوچنے لگیں۔ خالہ کو اس مرتبہ یقین سا ہو گیا تھا کہ یوسف ان کا کہنا مان لے گا اور نہ صرف اپنی ماں کی خواہش کو بلکہ اپنے مرحوم باپ کے فرض کو بھی پورا کرے گا۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ شاید اس بار ماں کی بات مان لے گا کیونکہ میں نے اپنی طرف سے ایک خط میں خالہ کی کیفیت کا ذکر بڑے جذباتی انداز میں کیا تھا۔

ایک شام حسب معمول جب میں خالہ کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹی ہوئی ہیں۔ایک بچہ ان کے سر کی مالش کر رہا تھا اور دوسرا بچہ ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ایک بچے کی ماں گرم چائے اور بسکٹ لے کر داخل ہوئی۔خالہ کی حالت دیکھ کر میں گھبرا گیا مگر خدا کا شکر تھا کہ ان کو صرف بخار تھا۔کرائے داروں نے ڈاکٹر کو بلوا بھی لیا تھا۔

مجھے دیکھ کر انہوں نے میز کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک لفافے میں بند یوسف کی چند تصویریں رکھی ہوئی تھیں جن کو خالہ ہر آنے جانے والے کو دکھاتی تھیں۔اسی لفافے کے برابر میں یوسف کا ایک خط بھی تھا۔ غالباً آج ہی آیا تھا۔ یہ خط خالہ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں یوسف کی شادی کا ذکر تھا اور اس سے جلد واپس آنے کی مانگ کی تھی۔میں خط پڑھتا گیا مگر ایک جگہ آکر رک گیا۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح یہ خبر خالہ کو سناؤں۔

"کیوں بیٹا کیا ہوا؟ کیوں رک گئے ؟ جلدی پڑھو۔کوئی بری خبر تو نہیں ہے۔" خالہ نے کہا۔

"نہیں خالہ ایک خوشخبری ہے۔"میں نے کہا۔

خط میں یوسف نے لکھا تھا کہ پچھلے سال اس نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی تھی اور دو روز پہلے ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔ اس کی بیوی کا نام صوفیہ ہے۔

خط پورا نہیں پڑھ پایا تھا کہ بچوں نے نانی نانی پکارنا شروع کیا۔گھبراہٹ میں خط پھینک کر میں پلنگ کی طرف لپکا جہاں خالہ بے ہوش پڑی ہوئی تھیں۔جلدی سے ان کے چہرے پر ٹھنڈا پانی چھڑکا ۔ان کو ہوش آ گیا تو میں نے انہیں یوسف کی شادی کے بارے میں بتایا۔

"یوسف نے ایک سال پہلے ہی شادی کرلی ہے اور مجھے بتایا تک نہیں گویا میں اس کا اپنا نہیں بلکہ غیر ہوگئی ہوں۔" خالہ نے کہا اور زاروقطار رونے لگیں۔

ان کے رونے کی آواز سن کر کئی عورتیں آگئیں۔ سب نے انہیں لاکھ سمجھایا مگر خالہ نے کسی کی نہ مانی۔

بیٹے کی شادی سے ان کے دل میں غم، غصہ، ،مایوسی اور نفرت کا ایک مشترکہ جذبہ پیدا ہوگیا۔وہ یوسف کا نام تک سننے کو تیار نہ تھیں اور نہ ہی اس کو خط لکھواتیں۔یوسف کے دو خطوط آئے تھے مگر ان کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔اسی طرح پانچ چھ مہینے گزرگئے۔یوسف کے خطوط برابر آتے رہے مگر خالہ نے مجھے جواب دینے نہیں دیا۔

سنیچر کو اکثر میں گھر ہی پر رہتا ہوں۔اس روز میں عموماً بازار جایا کرتا ہوں اور کبھی ادھر ادھر کا کام پورا کر لیتا ہوں۔ ویسے دن بھر آفس میں کام کرنے سے اتنی تھکن ہو جاتی ہے کہ بازار جانے کی ہمت نہیں ہوتی اور پھر شام کے وقت بازار میں جو سبزیاں ملتی ہیں وہ اتنی اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ ہفتے بھر کی سبزیاں سنیچر ہی کو خرید لیتا ہوں اور فرتج میں رکھ لیتا ہوں۔

میں بازار جانے کے لئے نکلا ہی تھا کہ ایک بچے نے آکر مجھے بتایا کہ خالہ نے مجھے فوراً بلایا ہے۔وہاں پہنچا تو خالہ نے بتایا کہ ایک تار آیا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ یوسف نے تار میں ماں کی خیریت پوچھی ہو گی مگر اس میں لکھا تھا: come airport December 10 flight BA 107 یعنی مجھے آج ہی ایرپورٹ جانا ہوگا۔یہ خبر سن کر خالہ کا مہینوں سے مرجھایا ہوا چہرہ اچانک کھل اٹھا اور کہا ”مجھے یقین تھا کہ میرا بیٹا مجھے دیکھنے کے لئے ضرور آئے گا۔“

پہلے مجھے فوراً ٹیکسی کا انتظام کرنے کو کہا مگر چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا: ”بیٹا دیکھو زیادہ وقت نہیں ہے۔یوسف اور اس کی بیوی بچے گھر آئیں گے۔ان کے لئے گھر میں انتظام کرنا ہوگا اور فی الحال گھر پر کچھ ہے ہی نہیں۔بھلا میں کیسے ان لوگوں کا اچھا استقبال کر سکتی ہوں۔ایسا کرو تم ٹیکسی لے کر ایرپورٹ چلے جاؤ جب تک کہ میں گھر کو ٹھیک ٹھاک کر کے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرلوں۔“

پلیزانس ایرپورٹ میں ایک بڑا مجمع تھا۔ایک تو سنیچر کا روز تھا۔سب سے زیادہ ہوائی جہاز اسی روز آتے ہیں۔ دوسری طرف ایر انڈیا کی روانگی کا وقت تھا۔مسافر تو ہوتے ہی ہیں مگر ان کو چھوڑنے کے لئے نہ صرف ان کے رشتے دار آتے ہیں بلکہ ان کے گاؤں کے بہت سے لوگ بھی آجاتے ہیں۔ اسی سنیچر کو انگلینڈ سے ایک چارٹرڈ فلائٹ بھی آنے والی تھی۔اس ہوائی جہاز کے آنے کے دن کی خوبی یہ ہے کہ دال پوری اور سموسے بیچنے والوں کی آمدنی میں بہت بڑا اضافہ ہو جاتا ہے۔کیونکہ اس جہاز کے آنے کا صحیح وقت معلوم نہیں ہوتا اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ جانے والے دوستوں یا رشتے داروں کو چھوڑنے آتے ہیں انہیں دال پوریوں اور سموسوں سے اپنا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔معمول کے مطابق اس چارٹرڈ فلائٹ سے آنے اور جانے والوں کو خیر مقدم اور خدا حافظ کرنے کے لئے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔

ایک مونگ پھلی بیچنے والے سے معلوم ہوا کہ چارٹرڈ فلائٹ پانچ گھنٹے لیٹ تھی مگر برٹش ایرویز کا ہوائی جہاز مقررہ وقت

پر آ رہا ہے۔ مجھے یوسف سے ملنے کی بیتابی تھی۔ صحیح وقت پر ہوائی جہاز قیامت برپا کر دینے والے شور سے زمین پر اترا اور تھوڑی دیر بعد رنوے پر اس کی آواز کے ساتھ ساتھ رفتار بھی کم ہو گئی۔ جب مسافر اترنے لگے تو میری نظر ہوائی جہاز کے بجائے اس پھاٹک پر تھی جس سے مسافر ایر پورٹ کے ٹرمنل میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک ایک کر کے موٹے پتلے دبلے کالے گورے مرد عورتیں جوان اور بچے سب ہی پھاٹک سے گذرکر ٹرمنل میں داخل ہوئے لیکن یوسف ان مسافروں میں نظر نہیں آیا۔

مجھے جہاں یوسف پر غصہ آ رہا تھا وہاں فکر بھی ہو رہی تھی کہ یوسف کیوں نہیں آیا۔ اتنے میں لاؤڈ اسپیکر سے خالہ کا نام پکارا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ برٹش ایرویز کے افسر سے ملنے آجائیں۔ گھبرایا ہوا میں فوراً کاؤنٹر پر گیا اور بتایا کہ خالہ کی جگہ میں آیا ہوا ہوں۔ مجھ سے وہیں رکنے کو کہا گیا۔ میں بہت پریشان تھا کہ کیا بات ہے۔ الٹی سیدھی باتیں ذہن میں آنے لگیں۔ کچھ دیر بعد ایک عورت کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ گود میں لئے ایک ایرہوسٹس آئی۔ اس عورت نے مجھے ایک خط دیا اور بتایا کہ وہ یوسف کے ساتھ کام کرتی ہے۔ ایرہوسٹس نے مسکراکر میرے ہاتھوں میں بچے کو تھما دیا۔ میں تو اتنا بوکھلا گیا کہ مجھے نہیں معلوم ہوا کہ ایرہوسٹس اور اس عورت نے مجھے کیا کہا اور کب چلی گئیں۔ میں تو صرف اس معصوم بچے کو دیکھ رہا تھا۔

ایرہوسٹس دوبارہ آئی اور مجھے انتظار کرنے کو کہا۔ بچے کو گود میں لئے میں کاؤنٹر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنے

جانے والی عورتیں بچے کو دیکھتیں اور مسکراکر چلی جاتیں۔پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک موٹا سا آدمی ایک ہینڈ بیگ اور دو سوٹ کیس لئے میرے قریب آیا ۔اسے دیکھ کر میں نے کہا: ''یوسف تم ہو۔ اتنے موٹے ہو گئے ہو کہ پہچانے نہیں جا رہے ہو''۔ اس سے گلے ملنے والا تھا کہ مجھے یاد آیا کہ میری گود میں بچہ ہے۔

''یوسف تمہاری بیوی کہاں ہے؟ کیوں نہیں آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے چھٹی نہیں ملی۔امی کیسی ہیں؟ بیمار تو نہیں ہیں۔ کیوں نہیں آئیں؟'' یوسف نے کہا۔

'' چلو تم ہی دیکھ لینا۔تمہارا ٹیلی گرام آج ہی ملا ہے۔ وہ آنا چاہتی تھیں مگر تمہاری بیوی اور تمہارے استقبال کے لئے گھر پر تیاری کرنی تھی۔اسی لئے انہوں نے مجھے بھیجا۔یار تم نے تو سب سے پہلے بچے کو بھیج کر مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا کرتا۔ ہینڈ بیگ سنبھالنا اور سوٹ کیس نکالنا تھا۔ ضروری کاغذات پر ایک نظر رکھنی تھی میں یہ سب اکیلے کیسے کرتا۔میرے دوست کا سامان آگیا تھا، اسی لئے میں اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا اور بچے کو تمہارے حوالے کردیا۔'' یوسف نے کہا۔

جب ہم دونوں باہر نکلے تو بھیڑ کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ میں نے بچے کو گود میں لیا ہوا تھا۔شاید لوگ یہ سوچتے ہوں گے کہ شاید بچے کی ماں نہیں ہے۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھے ۔بچہ میری گود میں آرام سے سو رہا تھا۔میں اسے دیکھتا رہا۔

واہ کتنی معصومیت تھی! وہ کبھی کبھی نیند میں مسکراتا تو اتنا پیارا لگتا تھا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

"اس کی ماں نے کیسے تمہارے ساتھ بھیج دیا؟" میں نے یوسف سے پوچھا۔

"وہاں کے لئے یہ ایک نئی بات نہیں ہے۔روزانہ جب وہ کام کرنے جاتی ہے میں ہی بچے کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ ضرورت پڑنے پر وہ خود اکیلی بچے کو لے کر چلی جاتی ہے۔" یوسف نے کہا۔

کافی دنوں کے بعد یوسف موریشس واپس آیا تھا۔ ماں سے ملنے کا اشتیاق تو تھا ہی مگر ایک تشویش بھی تھی کہا کہ ان کا ردعمل کیسا ہو گا۔

ٹیکسی پورٹ پہنچ چکی تھی۔ڈرائیور موکا اسٹریٹ کی طرف مڑا اور پھر لابوردونے اسٹریٹ جانے کے لیے ایک گلی سے گزرا، اور چند منٹ بعد خالہ کے گھر کے سامنے گاڑی روکی۔ہارن بجایا۔ خالہ جلدی جلدی گاڑی کے قریب آئیں۔

میں نے پہلے یوسف کو اترنے کو کہا۔جونہی وہ اترا ماں اس سے لپٹ گئیں۔

"میرے لعل تو آگیا۔ میں جانتی تھی کہ تو ضرور آئے گا۔اللہ تجھے خوش رکھے! تیری بیوی کہاں ہے؟اور۔۔۔۔" وہ کہہ ہی رہی تھیں کہ میں بچے کو گود میں لئے خالہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بچے نے آنکھیں کھول لی تھیں۔

میں نے خالہ کے ہاتھوں میں بچے کو تھماتے ہوئے کہا: "

خالہ اسے دیکھئے، کتنا پیارا ہے! آپ کو دیکھ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

خالہ نے بچے کو لیا، سینے سے لگایا۔ پیشانی، گال اور ہاتھ چومنے لگیں ۔ایسا لگا کہ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی ہو۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور شاید وہ پل بھر کے لئے اپنے یوسف کو بھول گئیں۔خالہ بچے کو اس طرح سینے سے لگائے ہوئے تھیں کہ یوسف ماں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

'' خالہ اندر چلیں۔'' میں نے کہا۔

'' دیکھو۔ بچہ بالکل میرے یوسف کی طرح ہے۔تمہاری بیوی کہاں ہے؟ تم اسے کیوں نہیں لائے؟'' خالہ نے یوسف سے پوچھا۔

'' اماں اسے چھٹی نہیں ملی اسی لئے میں بچے کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔آپ کچھ ایسی ویسی بات نہ سوچئے''۔یوسف نے کہا۔

کرائے داروں کی بیویاں اور بچے یوسف سے ملنے کے لئے بے چین تھے ۔سب نے یوسف کو سلام کیا۔

''دیکھو دیکھو بالکل میرے یوسف کی طرح ہے۔ کتنا پیارا ہے!'' خالہ نے سب کو بچہ دکھاتے ہوئے کہا۔

برآمدے میں کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ ایک خاتون نے ٹرے میں گلاس اور پانی کا ایک جگ لاکر میز پر رکھ دے۔ ایک دوسری خاتون گرم چائے بنا کر لائی۔ایک تیسری گرم گرم سموسے اور ''گاتو پیا'' لائی۔

یوسف کو یہ سب دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ ماں کی

خدمت کرنے کے لئے اتنے لوگ ہیں۔

"بیٹا یوسف، یہ سب خواتین اسی مکان میں میرے ساتھ رہتی ہیں۔" خالہ نے کہا اور سب سے ملوایا۔

"یوسف بھائی آپ کچھ لیجیے۔" ایک خاتون نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تو گاتو پیا کھاؤں گا۔ بہت دنوں سے نہیں کھایا ہے۔آپ لوگ بھی لیں۔" یوسف نے کہا۔

خالہ کی نظریں پوتے پر اتنی جمی ہوئی تھیں کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوا کہ میں نے یوسف کا سامان ٹیکسی سے نکال کر ان کے کمرے میں رکھ دیا ہے۔

"خالہ اب مجھے جانا ہے۔ اجازت دیجیے۔" میں نے کہا۔

تب خالہ اپنے پوتے سے نظریں اٹھا کر برآمدے میں دیکھا اور مجھ سے کہا: "نہیں ابھی تمہیں نہیں جانا ہے۔کچھ کھا پی لو، تھوڑی دیر بعد جانا"۔خالہ نے کہا۔

بچے کو سلانے کے لئے ایک پالنا کی ضرورت تھی۔خالہ نے اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔یوسف کو لے کرمیں دکان گیا جہاں سے پالنا کے علاوہ بچے کی ضرورت کا سامان خریدا۔

"دونوں سوٹ کیسوں میں بچے ہی کا سامان ہے۔ تم فکر نہ کرو جو کچھ ہم نے خرید لیا ہے وہ کافی ہے۔" یوسف نے کہا۔

"تمہارا بچہ تمہارے بغیر بڑے آرام سے ہے۔ سب کی گود میں آسانی سے چلا جاتا ہے۔بڑا ملنسار لگتا ہے' میں نے کہا۔

تین روز بعدیوسف مجھ سے ملنے آیا۔انگلینڈ جانے کی بات کرنے لگا۔اس کو پریشانی ہو رہی تھی کہ ماں کو کیسے یہ بات بتائے گا۔

"اتنی جلدی جانا تھا تو آئے ہی کیوں؟ خالہ تو تمہارے بغیر بھی جی رہی تھیں۔تمہارے جانے کے بعد بیچاری پر کیا گذرے گی!" میں نے کہا۔

"پر کیا کروں ۔مجھے ہر حالت میں جانا ہے۔" یوسف نے کہا۔

"پھر تو تمہیں خالہ کو رفتہ رفتہ تیار کرنا ہوگا۔وہ اب اس قابل نہیں رہیں کہ کوئی صدمہ برداشت کرسکیں۔" میں نے کہا۔

خالہ کے چہرے سے خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ ان کی توجہ کا محور یوسف نہیں بلکہ بچہ تھا۔ دوسرے بچے جب اس کے ساتھ کھیلتے تو خالہ ان سے احتیاط کرنے کو کہتی تھیں۔سولہ سال کی ایک لڑکی جو ایک کرایہ دار کی بیٹی تھی بچے کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ بڑے سلیقے والی تھی۔اپنی چھوٹی بہنوں کی دیکھ بھال وہی کرتی تھی۔یوسف نے اسے غور سے اپنی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے دیکھا اور اسے تسلی ہوئی کہ اس کے بچے کی دیکھ بھال اچھی طرح سے ہورہی ہے۔

رفتہ رفتہ یوسف نے خالہ کو آمادہ کیا کہ وہ اسے واپس جانے کی اجازت دیں۔

"امی اب میں ہر سال آتا رہوں گا چاہے کم ہی دنوں کے لئے آؤں۔" یوسف نے کہا۔

"میرے لعل، تمہیں یہاں بھی تو ایک اچھی نوکری مل سکتی ہے۔" خالہ نے کہا۔

یوسف ہزار بہانے بناتا رہا۔خالہ کو یقین ہونے لگا کہ

یوسف اب یہاں نہیں رکے گا۔ وہ اس گھڑی کے بارے میں سوچ کر کانپ جاتی تھیں جب ان کا پوتا ان سے جدا ہوگا۔

"بیٹا میں اپنے پوتے کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی۔" خالہ نے رو رو کر یوسف سے کہا۔

"امی آپ اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔" یوسف نے کہا۔

"ارے کیوں نہیں ۔وہ تو اتنا اچھا اور پیارا بچہ ہے۔وہ مجھ سے اتنا قریب ہو گیا ہے کہ سوچتا ہوگا کہ میں ہی اس کی ماں ہوں۔" خالہ نے کہا۔

"امی اگر ایسا ہے تو میں اسے آپ کے پاس ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں، اب تو آپ خوش ہیں۔لیکن آپ اس عمر میں اس کی دیکھ بھال کیسے کریں گی؟ آپ تھک جائیں گی۔" یوسف نے کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ میرے پوتے کی دیکھ بھال کرنے کے لئے یہاں کتنے لوگ ہیں۔تم نے دیکھا نہیں۔میرا پوتا تو یہاں کا شہزادہ ہے۔ شہزادہ!" خالہ نے خوشی خوشی کہا۔

خالہ سوچ رہی تھیں کہ اسی بہانے یوسف اکثر آتا رہے گا اور یوسف یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ اب انگلینڈ میں بچے کو نرسری میں نہیں رکھنا پڑے گا۔

□□□

روزہ

کہا جاتا ہے کہ ایک ایسا ملک ہے جہاں کا قانون ہے کہ رمضان کے مہینے میں دن میں کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں بند ہوں ۔کہاں تک ایسا ہوتا ہے وہ تو رمضان کے مہینے میں وہیں جاکر معلوم ہو سکتا ہے۔ہمارے وطن میں ایسا قانون نہیں ہے۔ہم کثیرالمذاہب ملک میں رہتے ہیں جہاں پر ہر ایک کو اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنا اس کے بنیادی حقوق میں شامل ہے۔

رمضان کے مہینے میں یہاں کی زندگی معمول پر ہوتی ہے۔ دن بھر دال پوری اور طرح طرح کے کھانے بیچنے والے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں کیونکہ غیر مسلم کے کھانے پینے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہاں عصر کی نماز کے بعد مسلمانوں کے گھروں میں اور مسجدوں کے آس پاس چہل پہل ہو جاتی ہے۔اس وقت مختلف قسم کے پکوڑے، کٹ لیس، تکہ ،کباب وغیرہ کے تلے جانے سے فضا ''معطر'' ہوجاتی ہے۔

نسرین ایک سرکاری دفتر میں کلرک ہے۔ایک مہینہ پہلے ہی اس کا تقرر ہوا ہے۔جس دفتر میں وہ کام کرتی ہے وہاں پہلے سے سات کلرک کام کر رہے ہیں۔ان میں تین غیر مسلم خواتین ہیں۔

ایک کلرک ہے جس کی عمر پچاس سال کی ہے۔ سب اسے چاچا کہہ کر پکارتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس کا اصل نام اشوک ہے۔ وہ بھی دوسروں کی عزت کرتا ہے اور ہنسی مذاق بھی کرتا ہے۔ وہ بہت ذہین ہے۔ اور انگریزی، فرنچ اور ہندی زبانوں میں مہارت رکھتا ہے۔ جب بھی کوئی خط یا رپورٹ لکھنی پڑتی ہے تو دفتر کا ہر کلرک لکھ کر پہلے اسے دکھاتا ہے اور پھر اپنے اعلیٰ افسر کو دیتا ہے۔وہ سنسکرت بھی جانتا ہے اور کیوں نہیں جانے گا۔ وہ ایک بہت پڑھا لکھا پنڈت مانا جاتا ہے۔ ہر سنیچر اور اتوار کو وہ پوجا پاٹ یا شادی بیاہ میں پروہت کی حیثیت سے مصروف رہتا ہے۔ایسے موقعوں پر اس کی تقریر میں اس کی زبان کی شیرینی کے ساتھ پیار بھرے پیغامات لوگوں کے دلوں پر اثر کرتے ہیں۔

کبھی کبھی دوسرے دفتروں سے کچھ لوگ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بارے ان سے پوچھنے کے لئے آجاتے ہیں۔اشوک صاحب ان لوگوں سے بہت پیار سے کہتے ہیں کہ وہ لنچ کے وقت آ جائیں۔اس وقت وہ انہیں تفصیل سے سمجھاتے اور مشورہ بھی دیتے ہیں۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ہندوستانی سیریئل یا فلم میں اگر کوئی لفظ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا ہے تو وہ اشوک صاحب سے آکر پوچھتا ہے اور وہ مزے لے لے کر سمجھاتے ہیں۔

نسرین بھی انہیں چاچا کہہ کر پکارتی ہے۔ اشوک صاحب اسے بیٹی کہتے ہیں کیونکہ وہ اس دفتر میں سب سے کم عمر کی

ہے۔ایک روز اشوک صاحب نے نسرین سے پوچھا: ''بیٹی کیا تم اردو پڑھ لیتی ہو؟''

''تھوڑی بہت پڑھ لیتی ہوں مگر بولنا مشکل ہوتا ہے۔'' نسرین نے کہا۔

'' اچھی بات ہے۔ہمیں اپنی زبان پڑھنی چاہیے۔''اشوک نے کہا۔

نسرین جاننا چاہتی تھی کہ اس سے یہ سوال کیوں پوچھا گیا مگر وہ چپ رہی۔

اشوک صاحب اور اس کے دوسرے ساتھی ہر روز اسی کمرے میں ہی اپنا لنچ لیتے ہیں۔پھر بعد میں کچھ دیر کے لئے ٹہلنے چلے جاتے ہیں۔کبھی تو لنچ کے بعد اشوک صاحب اپنے ہی کمرے میں رہتے ہیں تاکہ مذہبی رسوم کے بارے میں پوچھنے والے آکر ان سے بات چیت کرسکیں۔لنچ کے وقت نسرین بھی کبھی ایک خاتون کے ساتھ باہر ٹہلنے چلی جاتی ہے، کبھی دفتر ہی میں رہتی ہے۔

ایک روز لنچ ہی کے وقت ایک عورت اشوک صاحب سے کچھ پوچھنے آئی تو نسرین نے سوچا کہ بہتر ہے کہ وہ دفتر سے چلی جائے مگر اشوک صاحب نے اسے روکا اور کہا: ''بیٹی یہیں بیٹھو تاکہ جو کچھ یہ عورت پوچھے تم سن سکتی ہو مگر تمہارا دھرم اپنا ہے، اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔''

نسرین وہیں رک گئی۔اشوک صاحب نے رسم و رواج اور پوجا کے بارے میں بتایا اور کہا: ''دیکھو پوجا سے پہلے اور پوجا کے بعد گھر میں گوشت مچھلی نہیں پکنا چاہیے۔''

''کتنی دنوں تک؟'' اس عورت نے پوچھا۔

'' یہ آپ پر ہے۔اور اگر بالکل نہ پکے تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔مگر یہ آپ اور آپ کے پریوار پر ہے۔'' اشوک صاحب نے کہا۔

نسرین اپنے لنچ میں روٹی کے ساتھ کئی بار چکن، بیف، یا مچھلی کے کٹ لیس لائی تھی جس کی خوشبو دفتر میں پھیل گئی تھی ۔ایک دو بار تو اس کے ساتھ کام کرنے والی عورتوں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ کٹ لیس کس طرح بناتے ہیں۔ نسرین نے ان کو بتایا تھا۔

اشوک کی باتیں سننے کے بعد نسرین کو ایک جھٹکا سا لگا۔اب اسے یہ احساس ہوا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔اب یہ سوچنے لگی کہ کٹ لیس کی خوشبو سے چاچا پر کیا گذرتی ہوگی۔

اسی رات رمضان کا چاند نظر آیا۔اگلے روز نسرین خوش تھی کہ روزے کی وجہ سے اسے لنچ کے لئے کچھ نہیں لے جانا ہو گا۔

اشوک صاحب آفس میں پہلے سے موجود تھے۔جب نسرین د فتر میں داخل ہوئی تو اشوک صاحب نے کہا: ''رمضان مبارک ہو بیٹی! میرے لئے دعا ضرور کرنا۔''

''جی ہاں چاچا میں آپ کے لئے دعا ضرور کروں گی۔''نسرین نے کہا۔

لنچ کے وقت جب دوسرے کلرک اپنی روٹیاں نکال رہے

تھے تو اشوک نے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے لگا۔

"آج آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟" ایک ساتھی نے پوچھا۔

"نہیں۔نسرین بٹیا روزے سے ہے۔میں اس کے سامنے کھانا کیسے کھا سکتا ہوں۔میں نہیں کھاؤں گا۔" اشوک صاحب نے کہا۔

یہ سن کر نسرین رونے لگی۔

□□□

''مین نے گیارہ بار یہ فلم دیکھی ہے اور اب بھی دیکھ رہا ہوں تو مجھے بڑا مزہ آرہا ہے۔ ہر بار ایکٹنگ کے لحاظ سے مجھے نئی خوبی نظر آجاتی ہے۔ دیکھو دیکھو ہاتھ کے اشارے سے دلیپ کمار نے بہت کچھ کہہ دیا'' دادا نے کہا۔ (ہمارا بھی زمانہ تھا اور ہے)

''بھائی اس مسجد کو برباد نہیں ہونے دونگا'' (کریم چاچا)

بیٹے سے لپٹ کر رونے لگیں اور کہا: ''میں تمھارا نام بھول گئی ہوں۔ دیکھو میں سب کچھ بھولتی جارہی ہوں۔'' (لاوارث قبر)

''تمہارے والد نے کوئی وصیت نہیں کی تھی؟'' سردار نے پوچھا۔
''ہاں کئی بار زبانی کی تھی مگر میرے پاس کوئی تحریری وصیت نہیں ہے'' ظفر نے کہا۔
(مدرسہ)

''یادیں ہی تو اس عمر میں سہارا بن جاتی ہیں۔'' (ناجو خالہ)

STAR PUBLICATIONS PVT. LTD.
New Delhi